ماجد کی عقل مندی

(اور بچوں کی دیگر کہانیاں)

فیروز بخت احمد

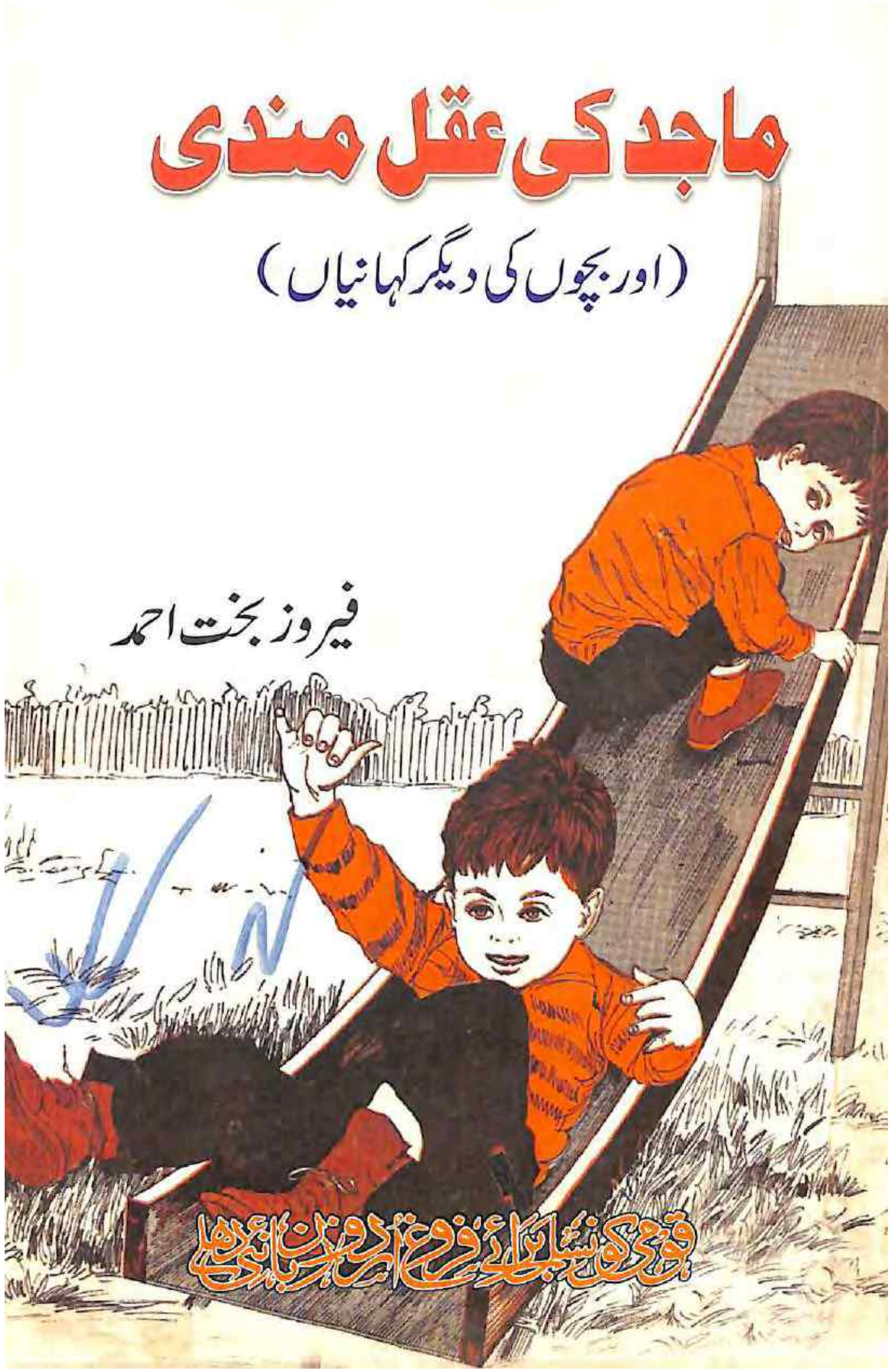

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ماجد کی عقلمندی

(اور بچوں کی دیگر کہانیاں)

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/24روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1579

Majid Ki Aqalmandi

By

Firoz Bakht Ahmed

ISBN :978-81-7587-764-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

دورِ حاضر میں ادبِ اطفال کے میدان میں ایک قحط سا آگیا ہے۔ ناول، افسانے وغیرہ تو بخوبی لکھے جارہے ہیں اور ان کی مقبولیت بھی قدرے بڑھی ہوئی ہے لیکن ادبِ اطفال کی اہمیت وافادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ادبِ اطفال کے لیے گرچہ نامساعد حالات ہوں لیکن چند ایک معروف اور قابلِ قدر نام متعلقہ ادب کے تعلق سے بھی مل جاتے ہیں۔ انھیں ناموں میں ایک نام نامی جناب فیروز بخت احمد کا بھی ہے۔ موصوف اپنی ابتدائی عمر سے ہی بچوں کے رسائل واخبارات جیسے "کھلونا"، "پیامِ تعلیم"، "نور"، "ثانی"، "چندہ نگری"، "شریر"، "گل بوٹے"، "جنت کا پھول"، "بچوں کا ساتھی" وغیرہ میں مذکورہ ادب کے تعلق سے قابلِ قدر اضافہ کرتے چلے آئے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے افسانے، ڈرامے، چھوٹی چھوٹی تجسس بھری دلچسپ کہانیاں وغیرہ لکھی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی، "ماجد کی عقل مندی: اور بچوں کی دیگر کہانیاں" ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کو پسند آئے گی۔

ویسے بھی بحیثیت ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور ہردل عزیز صحافی فیروز میاں ایک عرصے سے اپنی کاوشوں میں سرگرم ہیں۔ اردو کی خدمت کے لیے انھوں نے جو جہاد نہ صرف اردو بلکہ ہندی وانگریزی میں بھی چھیڑا ہے، اسے سماج میں تعریف کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ میں خود اردو کی ترویج کے لیے انگریزی میں لکھے گئے ان کے مضامین کو قدر اور انہماک سے پڑھتا چلا آیا ہوں۔ بلاشبہ ان کی نگارشات نے تاریکی میں شمع کا کام کیا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

دل کی باتیں

مطالعہ انسان کی ذہنی نشو ونما کے لیے ہمیشہ ٹانک کا کام کرتا ہے۔ میرے لیے یہ کام پیارا رسالہ ماہنامہ ''کھلونا'' کیا کرتا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ''کھلونا'' ہم سے روٹھ گیا، ٹوٹ گیا، بکھر گیا۔ ماہنامہ ''کھلونا'' اپنے دعوے کے عین مطابق 8 سے 80 سال کے بچوں کا رسالہ ہوا کرتا تھا۔ حاجی یوسف دہلوی کے تین فرزند، یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی نے اسے دنیا کی کسی بھی زبان کے بچوں کے رسالے سے بہتر و برتر بنا دیا تھا۔ ابتدائی دور میں یعنی 1948 میں اس کی قیمت ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔ جب سائز بڑا ہوا تو قیمت دو آنے ہوگئی۔ پھر اس کی قیمت بڑھتے بڑھتے 50 پیسے اور پھر 75 پیسے ہوگئی۔ جس وقت یہ 1987 میں بند ہوا تب اس کی قیمت چار روپے تھی جس کا سالنامہ ڈھائی روپے کا ہوتا تھا۔

اس رسالے کے لیے میری دیوانگی کا عالم یہ تھا کہ جس وقت اسے ہمارے اخبار والے، محبّ علی صاحب پہلی تاریخ کو انگریزی کے روزنامہ ''دا اسٹیٹسمین'' کے ساتھ ہمارے زینے میں ڈال کر جاتے تھے تو اس روز آنکھ فجر کی اذان کے وقت ہی کھل جایا کرتی تھی کہ آج تو ''کھلونا'' آنے والا ہے۔ پھر جب اسے ڈاک سے منگانا شروع کیا تو پہلی تاریخ کے پہلے اور بعد میں میں اپنے علاقے کے ڈاکیے گھنشیام سنگھ سے کئی مرتبہ پوچھ لیا کرتا تھا کہ کیا آج ''کھلونا'' آیا ہے۔ میری والدہ بھی اس رسالہ کو پسند کرتی تھی۔

عرصۂ دراز سے میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ ادبِ اطفال کے حوالے سے کوئی مثبت قدم اُٹھایا جائے۔ ''ماجد کی عقلمندی: اور ماہنامہ کھلونا کی کہانیاں'' انھیں خیالات کا عکس ہے۔

یوں تو راقم اپنے شعور کے روزِ اوّل سے ہی کسی نہ کسی صورت میں ادبِ اطفال سے منسلک رہا ہے۔ کبھی قاری کی صورت میں اُس نے تقریباً تمام ہی ادبِ اطفال سے متعلق معروف رسائل کا مطالعہ نہایت انہماک سے کیا۔ بالترتیب شعور کی پختگی کے ساتھ ہی بقلم ادبِ اطفال سے منسلک ہوگیا۔ حالانکہ اس وقت سن طفولیت میں تھا لیکن پالن ہارِ کائنات نے قلم جیسی عظیم نعمت عطا کردی تھی لہٰذا، جذبات سے ہم آہنگ کہانیاں، تصویری کہانیاں، نظمیں، کارٹون، لطیفے، کالمی خطوط وغیرہ کا آغاز ہوگیا۔ اُس کے بعد تو ایک سلسلہ ہی نکل چلا۔

دلچسپیوں میں خاطر خواہ تبدیلی کے پیش نظر دیگر موضوعات کی جانب منتقلی فطری عمل تھا۔ اپنی تمام تر مشغولیات کے باوجود بچوں کے ادب سے متعلق تحریروں کا سلسلہ جاری رہا۔

اس دور میں آکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بچوں سے متعلق ادب کا تصور سرزمین ہند کے طول وعرض میں گم ہوکر رہ گیا ہے۔ اب حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ ماہنامہ ''کھلونا''، ماہنامہ ''ٹافی''، ماہنامہ ''چندا نگری''، ''ماہنامہ غنچہ''، ''ماہنامہ ''شریر'' اور ماہنامہ ''جنت کا پھول''، ماہنامہ ''پریم'' وغیرہ تو اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ آج اردو میں بچوں کے معروف رسالوں میں ماہنامہ ''نور'' (رام پور)، ماہنامہ ''امنگ'' (دہلی)، ماہنامہ ''گل بوٹے'' (ممبئی)۔ اب کسی کو بچوں کے رجحانات ودلچسپیوں سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ماہنامہ ''کھلونا'' کے اوراق اور اُس کی کثیر اشاعت اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ متعلقہ رسالہ ہر خاص وعام میں نظر مقبولیت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے معیار کا اندازہ تو اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں سن طفولیت دلڑکپن کے رجحانات ودلچسپیوں سے ہم آہنگ کہانیاں، لطائف اور تصویری کہانیاں وغیرہ شائع ہوا کرتی تھیں۔ متعلقہ ماہنامہ میں شائع ہونے والے مواد کی ایک خوبی یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ اس میں تقریباً تمام ہی جذباتِ انسانی کو جلا بخشنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی تھی۔ دیومالائی کہانیوں سے لے کر والدین کی اہمیت تک ایک سلسلہ سے تقریباً تمام ہی کہانیاں منسلک ہوا کرتی تھیں۔ پراسرار کہانیوں سے بچوں میں جذبۂ تجسس کا فروغ

ہوتا تھا۔ کہانیوں میں جہاں بہت سے اوصاف ہوا کرتے تھے، وہیں ایک صفت یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ ہر کہانی اپنے تاثر کے ساتھ ہی کسی اخلاقی درس پر آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے بچوں میں اخلاقی تعلیم کا اعلیٰ ذوق فروغ پاتا تھا۔ لیکن کیا کیجیے، حالات کے بے رحم ہاتھوں سے کوئی بچا ہے!

ادبِ اطفال سے متعلق معیاری رسائل کے تاریخی دور میں داخل ہونے کے چاہے جو بھی اسباب ہوں لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ اب اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی ورنہ فطری اصولوں کے مطابق جس کی ضرورت ہوتی ہے، فرد اس کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ اس بات کو لے کر نوحہ کناں ہونا کہ طبقہ اردو کافی محدود ہو چکا ہے، یہ محض خام خیالی اور دل کے خوش رکھنے کو خیال اچھا ہے۔

فرد کی تعلیم و تربیت میں والدین اور اقربا کا کردار کافی موثر ہوتا ہے۔ فرد انھیں کے زیرِ سایہ آدابِ زندگانی سے روشناس ہوتا ہے۔ لہٰذا، ہمارا آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آئندہ کی نسلوں کو حقائق سے روبرو کرائیں۔

کسی بھی عنصر کو دو پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اوّلاً تو اس کو اس کی مادّی حیثیت سے دیکھا جائے۔ ثانیاً اس کے اندرون اور اثرات سے آشنائی حاصل کی جائے۔ آج ہمیں ادبِ اطفال سے متعلق حقائق ثانوی درجے کی حامل حقیقت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکے تو ہم بھی انھیں کے صف میں کھڑے ہو رہے ہیں جو محض مادّیت پسندی کے علمبردار تصور کیے جاتے ہیں۔ ہم اپنی آئندہ کی نسلوں کو کس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ ماہنامہ کھلونا کی معیاری کہانیوں کو یکجا کر دیا جائے تاکہ جو ایک خلا پیدا ہو گئی ہے، اس کو پر کیا جا سکے۔ امید ہے کہ قارئین کو یہ کوشش پسند آئے گی۔ ●●●

فیروز بخت احمد

A-202، ادیبہ مارکیٹ واپارٹمنٹس نزد رحمانی مسجد، مین روڈ، ذاکر نگر، نئی دہلی 110 025

فون:26984517، موبائل نمبر: 9810933050

ای میل:firozbakhtahmed07@gmail.com

فہرست

نمبر شمار	کہانی	مصنف	صفحہ نمبر
1۔	محمد علی کلے	فیروز بخت احمد ستمبر 1978	1
2۔	پہیلیاں	تمنا مظفر پوری جون 1968	8
3۔	پارٹنر	گارفیلڈ ہارپر اکتوبر 1966	14
4۔	پلنگ	شہلا تزئین مئی 1973	18
5۔	بچپن کی کہانیاں	شوکت پردیسی دسمبر 1973	23
6۔	ماجد کی عقلمندی	فیروز بخت احمد نومبر 1973	25
7۔	پروفیسروں کے لطیفے	محمد ہاشم جون 1968	28
8۔	قسمت کا فیصلہ	م۔ع۔غم۔ دسمبر 1966	32
9۔	تحفہ	فیروز بخت احمد نومبر 1973	36
10۔	راجہ ککڑوں کوں	غلام احمد فرقت مارچ 1966	39
11۔	رکشے والا	عادل امیر دہلوی	42
12۔	شاہی شاعر	م۔ندیم ستمبر 1966	43
13۔	شریر بچوں کا مشاعرہ	وحشی مارہروی مئی 1947	46
14۔	صلہ	اثر زید پوری اگست 1964	53
15۔	ہمیشہ الٹا رہنے والا جانور بسلوتھ	خلیل احمد	60
16۔	صلح نامہ	شکیل انوار صدیقی جنوری 1960	62
17۔	صورت اور سیرت	شمسہ بنت اخضر جولائی 1968	64
18۔	سوزی فنڈ	انور اشفاق اگست 1964	73
19۔	ٹیگور	قیصر سرمست ستمبر 1966	77
20۔	خزانے کی تلاش	انجم پرویز اگست 1968	82

21۔ تین بہنیں	ایس۔ایم۔حیات بادشاہ اگست1968	86
22۔ ننھی مرغ کا بچہ	بلرام دت شرما جون1968	92
23۔ میں نے ٹیوشن کی	سید حسین احمد زاہدی جولائی1972	97
24۔ زندگی کے میلے	فیصل نعیم بچوں کا ہلال مئی2009	101
25۔ بُری بچی	عدیل عباسی جامعی چڑیا کوٹی	105
26۔ عقلمند بچہ	ڈاکٹر نواز دیوبندی جولائی1983	106
27۔ بندر کا انصاف	فیروز بخت احمد نومبر 1973	108
28۔ نیکی کا پھل	پروانہ ردولوی مارچ1963	111
29۔ شیطانی عمل	مناظر عاشق ہرگانوی اپریل1971	115
30۔ نہ بھولنے والی شام	نسیم تیموری مئی1974	120
31۔ بھالو کی دم	شکیل انوار صدیقی1974	123
32۔ راز کی بات	سمیع الاسلام	125
33۔ ڈاکٹر اور مریض	خلیق انجم اشرفی	126
34۔ ہم فیل ہو گئے	پروانہ ردولوی	130
35۔ شرارت کا مزا	شفیع الدین نیر ایم۔اے۔	131
36۔ امتحان کی کامیابی	کیف احمد صدیقی	134
37۔ اسکول کھل گئے ہیں	سلام مچھلی شہری	136
38۔ روشنی کی واپسی	قدیر جاوید پریمی	138
39۔ البرٹ آئن اسٹائن ایک عظیم سائنسداں	محمد خلیل جنوری1967	142
40۔ اردو	کیف احمد صدیقی	145
41۔ بجلی کا انجینئر	فیروز بخت احمد دسمبر1975	147

●●●

محمد علی کلے

فیروز بخت احمد

آپ کسی بھی ٹیکسی ڈرائیور سے لندن میں پوچھ لیجیے، کسی کسی بھی آئس کریم والے سے کوالالمپور میں معلوم کر دیکھیے، کسی بھی قبائلی سے فجی کے جزائر میں پوچھ لیجیے، ہانگ کانگ میں کسی بھی کتب فروش سے معلوم کر لیجیے، غرض دنیا میں کسی سے بھی پوچھ لیجیے کہ محمد علی کون ہے؟ سب یہی جواب دیں: ''ایک عظیم ترین انسان اور باکسر'' لوگ شاید یہ نہ جانتے ہوں کہ امریکہ کا صدر کون ہے؟ وہ شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ چاند پر قدم رکھنے والا پہلا انسان کون ہے مگر وہ سب یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد علی کون ہے۔

محمد علی کی باکسنگ کی شروعات ایک چوری کے واقعہ سے ہوئی، جب وہ صرف بارہ برس کا تھا تو اپنی سائیکل کھو جانے کے باعث بے حد اداس تھا۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان قسم کھائی کہ وہ ضرور کسی نہ کسی دن سائیکل چور سے بدلہ لے گا۔ اس کی ملاقات ایک گشتی سپاہی سے ہوئی جس نے اسے بدلہ لینے کا ایک نیا طریقہ سکھایا۔ اس نے کہا، ''اگر تم اپنی سائیکل کے چور سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو پہلے لڑنا سیکھو۔'' پھر اسی وقت سے محمد علی باکسنگ کی باقاعدگی سے مشق کرنے لگا۔

17 جنوری 1942 کو جب 6 بج کر 35 منٹ پر لوئی ولا کے جنرل اسپتال میں کیسیس کلے اور اوڈیسا کلے کے یہاں 6 پاؤنڈ اور سات اونس کا ایک بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام کیسیس کلے جونیئر رکھا گیا۔ علی کے والد کلے سینئر ایک کمرشیل آرٹسٹ ہیں۔ ان کی خواہش تھی وہ امریکہ کے

مایۂ ناز مصور بنیں لیکن ان کا یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا، کیوں کہ گورے سماج کے اندر کسی باصلاحیت کالے کے لیے عظیم بننا نہایت مشکل ہے۔ نتیجے کے طور پر انھیں ایک کمرشیل آرٹسٹ کا کام کرنا پڑا۔ گوروں اور کالوں کے درمیان اس طرح کی جنگ سے محمد علی کو بہت نفرت تھی۔ وہ کالوں پر ظلم بالکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

شروع شروع میں علی نے جوان دنوں کیسس کلے کے نام سے جانا جاتا تھا، لوئی ولا میں 180 کشتیاں لڑیں۔ ان میں سے 110 اس نے جیت لیں۔ چند ہی ہفتوں میں وہ اپنے استاد جو مارٹن کا سب سے عمدہ مکہ باز بن گیا تھا۔ علی شہرت اور عزت لوئی ولا کے چھوٹے سے قصبہ سے نکل کر امریکہ میں اس وقت پھیلی جب 14 برس کی عمر میں اس نے ''گولڈن گلوز'' مکہ بازی کا خطاب حاصل کیا۔ پھر 1957 میں اس نے قومی ''گولڈن گلوز'' کا مقابلہ جیتا۔

بچپن میں علی ایک شرارتی لیکن ذہین طالب تھا۔ امتحان میں وہ کبھی فیل نہیں ہوا۔ 1960 کے روم اولمپک کھیلوں میں علی نے لائٹ ہیوی ویٹ کا فائنل جیت کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ یہیں سے علی کے وہ مقابلے شروع ہوئے جنھوں نے اس کو امر بنا دیا۔ طلائی تمغہ جیتنے کے بعد اب علی کی نظر عالمی خطاب پر تھی جو اس وقت سونی لسٹن کے پاس تھا۔ مگر سونی لسٹن سے مقابلہ کرنے سے پہلے اسے کئی مقابلے کھیلنے پڑے۔ ان میں سب سے سخت مقابلہ اسے ہنری کوپر سے کرنا تھا جو سارے یورپ میں اور خاص طور سے انگلینڈ میں بہت مقبول تھا۔ علی اس سے بھی لڑا اور شکست دے دی۔ ہنری پانچویں راؤنڈ کے بعد بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ حالت زیادہ خراب ہونے پر ریفری نے میچ روک دیا۔ اب علی نے سونی لسٹن سے ٹکر لی اور اسے ساتویں راؤنڈ میں شکست دے کر عالمی خطاب حاصل کر لیا۔ لسٹن اور علی کے میچ سے پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ لسٹن علی کی ایسی مرمت کرے گا کہ بے چارے علی کی جان ہی نکل جائے گی۔ مگر چھٹے راؤنڈ کے بعد لسٹن کو ہی اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی!

لسٹن کو ہرانے کے بعد علی کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ سیاہ فام مسلمانوں کی تنظیم میں شامل ہو گیا ہے۔ اسی وقت اس نے کیسس کلے سے بدل کر اپنا نام محمد علی رکھ لیا۔ میامی بیچ پر 25 فروری 1965 کو جب محمد علی نے بھالو جیسے طاقت ور اور بھینسے جیسے

پھر تیلیسٹن کو پچھاڑ دیا تو اسلام پر اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔علی کے اس اعلان سے ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا، خاص طور سے امریکہ میں ایک ''کالے مسلمان'' کا عالمی چیمپئن ہونا گوروں کی حاکمانہ ذہنیت کے لیے ناقابل قبول تھا، اس لیے محمد علی کو شکست دینے اور عالمی چیمپئن بننے کے لیے مختلف چہرے سامنے آتے رہے اور اس کے ہاتھوں بری طرح ہارتے رہے۔آخر سیاسی نسلی برتری کا خواب دیکھنے کے لیے 28اپریل 1967 کو اسے امریکی فوج میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا۔اس نے انکار کر دیا اور اس نامنصفانہ فیصلہ کے خلاف عدالت میں اپیل کر دی۔عدالت سے اس کے مقدمے کا فیصلہ بھی نہ ہوا کہ اس سے عالمی اعزاز چھین لیا گیا۔اس کے آئندہ مقابلوں کے کانٹریکٹ بھی منسوخ قرار دیے گئے۔پھر ہائی کورٹ نے اسے پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی۔مقدمے کے آخر میں علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا،''اگر میں کسی عورت کو مارتا کسی شخص کا قتل کر دوں یا لوٹ لوں تو ضرور یہ سزا میرے لیے شرم کا باعث بن سکتی ہے۔میرے لیے تو یہ فخر کی بات ہے میں ایک بہتر مقصد کے لیے جیل جاؤں۔''

ان دنوں ویت نام کی جنگ زوروں پر تھی۔پانچ لاکھ امریکی فوج ویت نام پہنچ کر ویت نامیوں کا خون بہا رہی تھی۔امریکہ میں 18 سال سے زیادہ عمر کے ہر نوجوان کو فوج میں بھرتی ہونے کی تربیت دی جاتی ہے۔

علی نہایت ہی ذہین شخص تھا۔جب اسے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ایک معمولی سے امتحان کے لیے پرکھا گیا تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔امریکی حکمران اس بات پر حیران تھے کہ وہ شخص جو مفکرانہ اور فلسفیانہ باتیں کرتا ہے، اتنا چھوٹا سا امتحان بھی کیسے نہیں پاس کر سکا؟ جو شخص شاعری کرتا ہے، ہر موضوع پر بول سکتا ہے، جو کروڑوں روپے کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اتنا کم عقل کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک دفعہ پھر علی کا بڑے بڑے نفسیاتی ماہروں نے دوبارہ امتحان لیا۔پھر فیل ہو گیا۔امریکی بھی کچھ کم نہیں تھے۔جب انھوں نے دیکھا کہ انسان تو علی کو ہرانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انھوں اس کا آئی۔کیو۔(I.Q.) مشینوں سے چیک کیا۔آئی۔کیو۔کی ذہانت ناپنے کا ایک معیار ہے جدید ترین مشینوں پر علی کی ایک نہ چلی اور نتیجہ یہ ہوا کہ علی کا آئی۔کیو۔بہت اچھا نکلا۔دراصل یہ محمد علی اس لیے کر رہا تھا کہ مظلوم ویت نامیوں کا خون نہیں کرنا چاہتا

تھا۔علی کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ سے کمزور لوگوں کا دوست رہا ہے۔آخر میں حق اور سچ کی فتح ہوئی۔ مقدمے کا فیصلہ علی کے حق میں ہوا۔اخباری نمائندوں نے علی سے پوچھا کہ، وہ اپنی رہائی کو کس طرح منانا چاہتا ہے؟ محمد علی نے مسکراتے ہوئے کہا،"میں پہلے خدا کے حضور میں ایک طویل سجدہ شکر ادا کرتا ہوں۔یہی میرا جشن ہے۔"

علی اکتوبر 1970 میں دوبار باکسنگ کے میدان میں آیا اس نے کہا کہ اس کی باکسنگ کے تین سب سے بہتر سال جیل میں اور مقدمہ بازی کی نذر ہو چکے ہیں جس کا اسے ساری زندگی افسوس رہے گا۔رنگ میں آتے ہی علی نے جیری کویری اور آسکر بونا وینا کو بری طرح شکست دی۔ اب اسے عالمی اعزاز حاصل کرنے کے لیے اس وقت کے چیمپئن جو فریزیئر سے مقابلہ کرنا تھا۔ اس مقابلے کے لیے علی نے سخت ترین مشق کرنی شروع کر دی۔ادھر فریزیئر نے بھی اپنا ٹائیٹل برقرار رکھنے کے لیے خطرناک طرین ٹریننگ شروع کر دی۔دونوں باکسر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔اس مقابلے کو باکسنگ کی تاریخ کا سب سے زیادہ خطرناک مقابلہ قرار دیا گیا۔ دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ اس لڑائی سے قبل ان میں سے کسی باکسر نے کوئی مقابلہ نہیں ہارا تھا۔ مقابلہ ایسے دو شیروں کے درمیان تھا جنھوں نے ہار کبھی نہیں دیکھی تھی۔8 مارچ 1971 کو میڈیسن اسکوائر گارڈن میں بیسویں صدی کا یہ خطرناک ترین مقابلہ ہوا اور محمد علی کو اپنی پیشہ ورانہ مکہ بازی میں پہلی دفعہ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔مقابلہ پائنٹس کے اوپر جو فریزیئر کے حق میں گیا۔بعض ماہرین کا خیال تھا کہ جیوری نے علی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فریزیئر نے علی کو کافی مار لگائی تھی۔یہ مقابلہ اتنا خوں خوار تھا کہ فریزیئر کو اسپتال جانا پڑا تھا۔جب کہ محمد علی چار مہینے بعد دوبارہ باکسنگ کے قابل ہو سکا تھا۔

زندگی کی اس پہلی ہار کے بعد محمد علی نے ہمت نہ ہاری۔اس نے فریزیئر سے دوبارہ مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔مگر اس مقابلے سے پہلے اسے چند دوسرے باکسروں کو ہرانا تھا۔۔۔محمد علی نے جمی ایلس، فلوئیڈ پیٹرسن، باب فوسٹر اور جو بگنو کو ایک ایک کر کے شکست دی مگر کین نارٹن کے ساتھ کھیلتے ہوئے اسے نہ صرف دوسری ہار کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اپنے جبڑے کی ہڈی بھی تڑوانی پڑی۔بات یہ ہوئی کہ نارٹن سے مقابلہ کے وقت دوسرے ہی راؤنڈ میں اس کے جبڑے کی ہڈی

چیخ گئی۔ باقی سب راؤنڈ علی نے اسی چٹخی ہوئی ہڈی کے ساتھ کھیلے، جس کی وجہ سے بہت دن اسے اسپتال میں چپ چاپ منہ باندھے پڑے رہنا پڑا۔ اس سے علی کے حریف بہت خوش ہوئے وہ سمجھے کہ علی کی مکہ بازی اب ختم ہوگئی۔ مگر علی ایک عظیم باکسر ہے۔ اس نے دوسری بار عالمی اعزاز حاصل کرنے کے لیے صحت یاب ہونے پر پھر کوشش شروع کر دی۔ اس درمیان جو فریزیئر کو جارج فورمین نامی شخص نے دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے عالمی خطاب جیت لیا۔ یہ بات 1972 کی ہے۔ پھر 1973 میں علی نے دوبارہ کھیلتے ہوئے میچ میں نارٹن کو شکست دے کر اپنی ہار کا بدلہ چکا دیا۔ جنوری 74 میں علی نے فریزیئر سے دوبارہ مقابلہ کیا اور اپنی ہار کا حساب چکا لیا۔

علی کی نظر اب جارج فورمین سے اپنا خطاب چھیننے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس صدی کا عظیم ترین سنسنی خیز مقابلہ 31 اکتوبر 1974 کو صبح کو زائر کے دارالخلافہ کنشاسا میں ہوا۔ ابھی سورج نکلا بھی نہ تھا کہ کنشاسا کا اسٹیڈیم تقریباً ایک لاکھ لوگوں سے بھر گیا۔ شروع کے راؤنڈ میں علی نے فورمین کو خوب چڑایا، خوب منہ بنائے اور خوب نچایا۔ فورمین پے در پے علی پر وار کرتا رہا۔ علی تتلی کی طرح ناچتا شہد کی مکھی طرح پھرتی سے بھاگتا اور فورمین کے وار خالی جاتے۔ آخری تین راؤنڈ میں علی نے فورمین کو مار مار کے بھرکس نکال دیا اور آٹھویں راؤنڈ میں باکسنگ کی دنیا کا بادشاہ بن گیا۔ مقابلے سے پہلے لوگوں نے ساری شرطیں فورمین کی جیت پر لگا رکھی تھیں مگر خدا پر یقین رکھنے والے نے کئی دفعہ اعزاز بچایا۔

بیسویں صدی کا تیسرا سنسنی خیز مقابلہ ایک دفعہ پھر علی اور جو فریزیئر کے درمیان ہوا۔ یہ مقابلہ منیلا میں ہوا جو فلپائن کی راجدھانی ہے۔ دونوں پرانے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے باکسر پھر میدان میں ایک دوسرے کو ختم کر دینے کی کوشش میں اترے۔ میدان میں اترنے کے بعد علی نے حسب عادت چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ فریزیئر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پہلے تین راؤنڈ میں تو علی کا پلہ بھاری رہا مگر چوتھے راؤنڈ سے فریزیئر کو برتری حاصل ہوگئی۔ اور اس نے پروہی خونخوار مار لگانی شروع کر دی جو اس نے 1971 میں لگائی تھی۔ گیارھویں راؤنڈ تک علی بری طرح پٹا لوگوں کو خیال ہو گیا تھا کہ علی اب نہیں ٹک سکتا۔ مگر نہ جانے کہاں سے آخری تین راؤنڈ میں علی نے وہ تابڑتوڑ گھونسے فریزیئر کے مارے کہ چودھویں راؤنڈ میں اس کو رِنگ سے

باہر جانا پڑا۔ اس دن کے بعد سے آج تک فریزیئر رینگ میں نہیں گیا۔ اس طرح تین مقابلوں میں جوان دونوں کے درمیان ہوئے ایک فریزیئر نے اور دو علی نے جیتے۔ پھر علی نے اور کئی سخت مقابلے کر کے اپنا اعزاز برقرار رکھا جس میں جو بگنر سے اس کا دوسرا مقابلہ بھی شامل ہے۔

تقریباً تین سال سے علی ریٹائر ہونے کے اعلان کر رہا ہے، مگر اس اعلان کو اس نے عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔ آخر ایک دن وہی ہوا جس کا سب کو ڈر تھا۔ 16 فروری 1978 کو ایک گمنام باکسر لیون اسپنکس نے پائنٹس پر علی کو ہرا دیا۔ علی کے شائقین یہ چاہتے تھے کہ علی چمپئن رہتے ہوئے ریٹائر ہو جاتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ علی کی عمر مقابلے کے وقت 36 سال کی تھی، جب کہ اس کا حریف 25 سال کا ایک تندرست نوجوان تھا۔ عمر نے علی کا ساتھ نہ دیا اور لیون اسپنکس نے اس سے اعزاز چھین لیا۔ علی کے ہارنے سے لوگوں کو بہت رنج ہوا۔ مگر انھیں پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ مقابلہ ہارنے کے بعد علی نے لیون اسپنکس کی تعریف کی، جب کہ علی عام طور پر حریفوں کی تعریف نہیں کرتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لیون اسپنکس ایک بہترین باکسر ہے۔ خیر جو بھی ہے اس سے علی کو پسند کرنے والوں کو شدید افسوس ہوا۔ علی نے یہ بھی کہا کہ اس نے اس مقابلے کو ایک معمولی مقابلہ سمجھا تھا جو اس کی غلط فہمی تھی۔ اب 15 ستمبر 1978 کو اک دفعہ پھر تیسری بار علی اپنا خطاب حاصل کرنے کے لیے لیون اسپنکس سے مقابلہ کرے گا۔

علی نہ صرف ایک عظیم باکسر ہے بلکہ وہ ایک فلسفی، مفکر اور مقرر بھی ہے۔ امریکہ کے چند بہترین مقرروں میں اس کی گنتی کی جاتی ہے۔ وہ ایک پکا مسلمان ہے اور ہر وقت قرآن شریف پاس رکھتا ہے۔ علی نے اپنی دولت کا بیش تر حصہ امریکہ کے کالے مسلمانوں اور اسلام کی تبلیغ پر لگایا ہے۔ علی اپنے پیسے سے امریکہ میں ایک بہت بڑی مسجد بھی تعمیر کرا رہا ہے۔ علی کس قدر کا پکا مسلمان ہے، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

جب علی اور فریزیئر کے درمیان 1975 میں تیسرا مقابلہ ہو چکا تو ہوٹل میں ہالی ووڈ کی ایک مشہور فلمی کمپنی نے علی کو دس کروڑ کی پیش کش کی کہ وہ فلموں میں حصہ لینے لگے۔ مگر علی نے صاف انکار کر دیا۔ اتنا بڑا معاوضہ کسی بھی ہالی ووڈ ایکٹر کو نہیں دیا گیا۔ کمپنی کی ڈائرکٹر مارگریٹ نے علی کو یہ یقین بھی دلایا کہ شوٹنگ کی تاریخیں علی کی مرضی کے مطابق طے کی جائیں گی اور جتنے دنوں میں علی

چاہے فلم کو مکمل کر سکتا ہے۔ انھوں نے اسے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ اسے راتوں رات دنیا کا مشہور ترین اور امیر ترین ایکٹر بنا دیں گے۔ مارگریٹ نے اس سے خوبصورت اسٹار کو بہت قریب سے دیکھا ہے، مگر نہ معلوم علی میں وہ کون سی بات ہے جو ہر دیکھنے والے کو محسور کر لیتی ہے۔ تو کیا علی نے اس پیش کش کو رد کر کے بے وقوفی کی تھی؟ نہیں، بالکل نہیں، کیونکہ یہ اس کے مذہب کے خلاف ہے زیادہ تر فلمیں بیہودہ ہی ہوا کرتی ہیں۔ علی کو سستی شہرت، جھوٹی عزت اور کالے دھن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے جتنی شہرت اور عزت ملی اتنی شہرت بادشاہوں اور لیڈروں تک کو نہیں ملی۔ علی دولت کا بھوکا نہیں۔ جس وقت محمد علی باکسنگ میں اپنا جوہر دکھا رہے تھے، اُس دور میں فٹ بال کے مشہور ترین کھلاڑی پیلے، ٹینس کھلاڑی جیمی کانرس، یاں بورگ اور ایکٹر مارلن برانڈو سب سے زیادہ مشہور تھے مگر علی صحیح معنوں میں اِن سب سے زیادہ مشہور تھا۔ وہ ایک معمولی انسان کی طرح رہتا ہے، زندگی میں اس کا اپنا الگ نصب العین ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے، جس کی خاطر اسے چیمپئن شپ سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ وہ مظلوموں کی خدمت کرنا چاہتا ہے، وہ چاہے گورے ہوں، چاہے کالے، چاہے امریکی ہوں یا افریقی۔ علی نے ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیا ہے۔ دس کروڑ تو کیا دس ارب روپے بھی علی کو نہیں خرید سکتے کیونکہ علی زندگی کی ان حدوں میں پہنچ گیا ہے جہاں جھوٹی شان اور عزت انسان کے لیے بے معنی بن کر رہ جاتی ہے۔

آج علی ہر انسان کا ہیرو ہے۔ جہاں وہ جاتا ہے، لاکھوں شیدائی وہاں پہنچ کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ عالمی اعزاز کھو دینے کے بعد بھی علی کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس کے دل میں سب سے زیادہ محبت اپنے مرحوم استاد عالی جاہ محمد کے لیے ہے، جنھوں نے اپنی جدوجہد سے نہ صرف علی کو مسلمان بنایا بلکہ سارے امریکہ میں اسلام سے پھیلایا۔ اس کا فیصلہ ہے کہ وہ باکسنگ سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنا تمام وقت اسلام کی تبلیغ اور اسلامی مساوات کے مطابق افریقی باشندوں کے لیے باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے صرف کرے گا۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، ستمبر 1978ء)

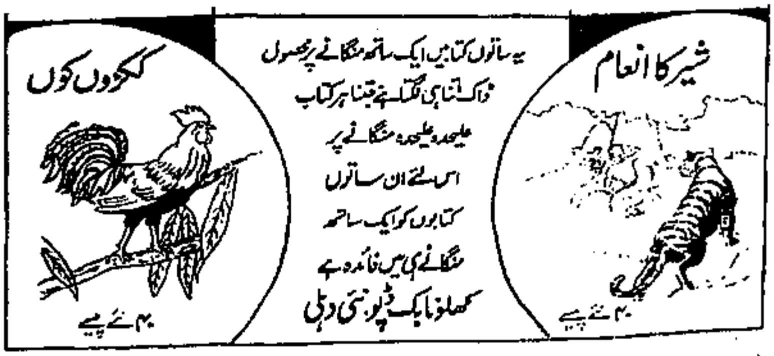

پہیلیاں

تمنا مظفر پوری

امّی، امّی! بوجھیے تو یہ پہیلی:

ایک مرغا چشم دیدم چلتے چلتے تھک گیا
لاؤ چاقو کاٹو گردن پھر بھی وہ چلنے لگ گیا

گھر میں داخل ہوتے ہی زیبا نے اپنے امّی کے دماغ کا امتحان لے ڈالا۔ امّی کو ان پہیلیوں سے کیا واسطہ؟ انھیں زمانہ ہوا ان چیزوں کو بھولے ہوئے۔ بڑوں کے رسالوں میں لطیفے اور کارٹون تو ہوتے ہیں لیکن ایسی پہیلیاں کہاں! امّی بہت چکرائے اور زیبا نے خوشی سے اچھل کر کہا۔ ''امّی نے نہیں بوجھا، امّی نے نہیں بوجھا! میں بتاؤں امّی؟''

امّی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ارے بھئی یہ سب چیز میں اب بھول گیا۔ یہ تم بچّوں کے کھیلنے کی چیزیں ہیں۔'' اور زیبا نے جھٹ کھلونا کے نئے شمارے میں پڑھی ہوئی پہیلی کا جواب بتا دیا۔ ''مونپنسل۔''

شام کا وقت ہو یا دوپہر کا جب فرصت مل گئی تین چار بچے مل بیٹھ جاتے ہیں اور پہیلیاں بجھانے لگتے ہیں۔

بوجھ پہیلی سکھی سیانی
آدھا پھول آدھا پانی

جھٹ کسی نے جواب دیا۔ ''گلاب'' (گل+آب)

پھر کسی دوسرے نے بوجھایا۔ ''سفید بلی سبز پونچھ، نہ بتائی جائے تو نانی اماں سے پوچھ۔'' اگر واقعی کسی نے نہ بوجھا تو نانی اماں نے بتا دیا کہ ''مولی'' ہے۔ اور جب بچے نانی اماں کے پاس پہنچ گئے تو انھوں نے بھی ایک پہیلی کا جواب مانگا:

ایک پہیلی میں کہوں تو سن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اڑ گئی باندھ گلے میں سوت

انور میاں خوشی سے اچھلتے ہوئے چلائے۔ ''میں بوجھ گیا، میں بوجھ گیا۔'' ''پتنگ''

نانی اماں اور دادی اماں سے سیکھ سیکھ کر بچے ایک دوسرے سے پہیلیاں بوجھنے لگے۔

بچوں کو جب کوئی نیا رسالہ ملتا ہے تو پہلے وہ لطیفے اور پہیلیوں کے صفحے ڈھونڈتے ہیں۔ انھیں آپس میں پہیلیاں بوجھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ پہیلی بوجھنے کے لیے بچے خوب غور کرتے ہیں اور سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ جب کوئی بچہ پہیلی کا صحیح جواب بتا دیتا ہے تو اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اگر کسی نے صحیح جواب نہ دیا تو پہیلی کا جواب مانگنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔ پھر صحیح جواب بتا کر اور مزہ لیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معمولی پہیلی کو بچے سمجھ نہیں پاتے اور جب صحیح جواب بتایا جاتا ہے تو انھیں اپنی بیوقوفی پر ندامت ہوتی ہے پھر وہ دوسری پہیلی بوجھنے کے لیے عقل اور ذہن کو حاضر کر لیتے ہیں۔

پہیلیاں بوجھنے کا کھیل دماغی کھیل ہے۔ اس سے بچوں کی عقل بڑھتی ہے، ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے دماغی ورزش والا کھیل کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان جب تہذیب اور سماج کے دائرے میں آیا تو اس کے ساتھ ہی پہیلیاں بھی آئیں۔ درحقیقت ہر نئی چیز انسان کے لیے ایک پہیلی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق وہ سوچتا ہے کہ کیا ہے؟ کیسے ہے! کیسے ہوا؟ کیسے بنا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پھر وہ صحیح جواب پا لیتا ہے۔ گویا ہر وہ بات یا وہ چیز جو جلد سمجھ میں نہ آئے وہی پہیلی ہے۔ اسی لیے نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ ''کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو۔''

زندگی اور ادب دونوں میں پہیلی کا سلسلہ پرانا ہے۔ مصر میں یہ رواج تھا کہ لوگ پہیلیوں میں باتیں کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں بھی بہت پرانی پہیلیاں ملتی ہیں۔ فرانس میں اٹھارھویں صدی میں

پہیلیوں کا اتنا رواج تھا کہ وہاں ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار پہیلیاں ہیں۔ بہت سے واقعات اور قصے ایسے مشہور ہیں جن میں پہیلیوں کے ذریعے ہی پیغام آتے جاتے تھے۔ جیسے حضرت رابعہ بصریہ (717-801) سے ایک واقعہ منسوب ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے قریب میں ٹھہرے ہوئے ایک بزرگ کی دعوت کی اور جس نوکرانی کے ہاتھ خوان بھیجا اس سے یہ پیغام بھی کہلایا:

چودھویں کا چاند ہے دریا ہے لبریز
حلال کھائیو حرام چھوڑ دیجو

بزرگ کو کھانا دے کر نوکرانی بزرگ کا یہ جواب لائی۔

تیرھویں کا چاند تھا دریا گیا گھٹ
حلال کھایا حرام چھوڑ دیا

نوکرانی کے اتنا کہتے ہی حضرت رابعہ بصریہ نے جواب طلب کیا، کیونکہ اس نے چودہ روٹیوں میں سے ایک روٹی اور لبالب بھرے ہوئے پیالے میں سے کچھ گوشت اور شوربہ راستے میں کسی فقیر کو دے دیا تھا اور جانتے ہو وہ حلال حرام کیا پہیلی تھی؟ حلال تو سب چیز تھی لیکن حرام وہ تھا جو بزرگ نے دانت میں پھنسے ہوئے ریشے وغیرہ خلال کر کے نکالے تھے۔

ہندوستان میں امیر خسرو ایک بہت پرانے شاعر گزرے ہیں۔ ان کی پہیلیاں اشعار میں ہیں جو مشہور ہیں، مثلاً۔

جل کر بنے جل میں رہے
آنکھوں دیکھا خسرو کہے

(کاجل)

یا......................

ساون بھادوں بہت چلت ہے
ماگھ پوس میں تھوڑی
امیر خسرو یوں کہے

تو بوجھ پہیلی موری

(موری۔تالی)

سنسکرت اور ہندی کے شاعروں نے بھی بہت سی پہیلیاں کہی ہیں۔سنسکرت کی ایک پہیلی ہے۔

پانچ بھارتا نہ پانچالی دوئی جیہوانہ چہ سرپنی

وانری نہ کرشنسیا تسیا ہنگ کل بالیکا

(پانچ شوہر والی ہوں لیکن پانڈوؤں کی بیوی دروپدی نہیں ہوں۔ دو زبانیں ہیں لیکن ناگن نہیں ہوں، اور کالا چہرہ ہے لیکن بندریا نہیں ہوں، بگر میں ہوں کایستھ خاندان کی لڑکی)۔

اس پہیلی کا جواب ہے۔"قلم" (قلم ہندی میں مؤنث ہے) دیکھو اسے پانچوں انگلیوں سے پکڑ کر لکھتے ہیں۔نب میں دو زبانیں سی ہوتی ہیں۔قلم کا منہ کالا ہوتا ہے اور لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ تر کایستھ ہی کرتے تھے۔

پہیلیاں تین طرح کی ہوتی ہیں!

(1) شعروں میں۔جیسے:

گلشن میں ایک شجر ہے جس کو کبھی نہ چین

تن پر غمِ حُسن ہے من میں غمِ حُسین

(منہدی)

(2) قافیہ والے جملے،یعنی تک بندی ہیں،جیسے:

دو منہ چھوٹا ایک منہ بڑا

آدھا آدمی لے کے کھڑا

بیچ کمر میں لگادے پھانسی

نام سن کر آوے ہنسی

(پائجامہ)

(3) سیدھی سادی نثر میں،جیسے:

"وہ کون سی چڑیا ہے جس کے سر پر دو پیر ہیں۔" (سب چڑیوں کے سر، پر اور دو پیر ہوتے ہیں۔)

پہیلیوں میں حساب کے سوال بھی ہوتے ہیں، جیسے۔ ''ایک رئیس، ایک نوکر تیس روپے ماہوار پر رکھتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ جب چاہے گا اتنے روز کی تنخواہ دے کر اسے ہٹا دے گا اور تنخواہ نقد روپے میں نہیں دے گا بلکہ اس کے پاس پانچ انگوٹھیاں ہیں جن کی مجموعی قیمت تیس روپے ہے۔ تنخواہ میں اتنی قیمت کی انگوٹھی دے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس کی انگوٹھی کی الگ الگ قیمت کیا ہوگی۔ خیال رہے کہ مہینے کے کسی روز بھی نوکر کو ہٹایا جا سکتا ہے اور انگوٹھی بغیر کاٹے ہی دینا ہے۔'' (کل انگوٹھیاں پانچ ہیں۔ پانچوں کی مجموعی قیمت 30 روپے ہوتی ہے۔ اور مہینے میں تیس دن ہوتے ہیں۔ اب انگوٹھی کی قیمت اس طرح بٹھائی جائے کہ کل جمع تیس ہو اور مہینے کے کسی دن بھی ہٹایا جائے تو تنخواہ دینے میں دقت نہ ہو۔ اس کا ایک فارمولا بناؤ۔ یعنی کم سے کم دن ایک ہے۔ اس کو دوگنا کرتے چلے جاؤ۔ 1 کا دوگنا 2۔ 2 کا 4۔ 4 کا 8۔ 8 کا 16۔ لیکن 16 سے 31 ہو جاتا ہے یعنی ایک دن اور ایک روپیہ زیادہ۔ لہٰذا 15 مانو۔ اس طرح انگوٹھیوں کی قیمت 1، 2، 4، 8 اور 15 روپے ہے، جو مہینے کے کسی دن بھی نوکر کو ہٹانے پر آسانی سے دی جا سکتی ہے۔)

ایک سائنسی پہیلی سنو۔ ''ایک دہی والی دہی بیچتے بیچتے تھک کر ایک تالاب کے کنارے آرام کے لیے بیٹھ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک آدمی آتا ہے۔ وہ دہی والی سے ایک کلو دہی مانگتا ہے۔ دہی والی کے پاس دہی، دہی کی ایک خالی ہانڈی اور ایک کلو کا باٹ ہے۔ اس کے پاس کوئی ترازو نہیں لیکن وہ ٹھیک ٹھیک وزن کر کے دے دیتی ہے۔ کیسے؟'' (یہ ایک فزکس کا سوال ہے جو آرکمیڈیز کے اصول پر مبنی ہے۔ دیکھو، خالی ہانڈی اور وزن کرنے کا باٹ موجود ہے۔ وزن کرنے کے لیے ترازو نہیں لیکن سوال میں تالاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔ ہاں تو پہلے تالاب میں خالی ہانڈی کو ڈالو پھر اسی ایک کلو کے باٹ کو ہانڈی میں ڈال دو۔ ہانڈی وزن سے پانی میں ڈوب جائے گی۔ جہاں تک اندر پانی میں ہانڈی ڈوبتی ہے وہاں پر نشان لگا دو۔ اب باٹ کو نکال کر اس میں دہی ڈالو، اور اس وقت تک ڈالتے رہو جب تک کہ ہانڈی میں لگایا گیا نشان پانی کی سطح تک نہ پہنچ جائے۔ جب نشان تک ہانڈی پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ دہی کا وزن پورا ایک کلو ہو جاتا ہے۔ اس طرح دہی والی دہی وزن کر کے دے دیتی ہے۔)

اب ایک دو پہیلیاں بوجھو اور اس کے بعد تم خود کچھ پہیلیاں لکھ کر شائع کراؤ۔

وہ کون سا جانور ہے، جس کا کان کاٹ لینے پر بڑا جانور بن جاتا ہے۔
(خرگوش۔خر+گوش)

ایک ناگن لہراتی جائے
پھنکار سے دل دہلاتی جائے
نگلے اُگلے لاکھوں من
سونپیں اس کو تن من دھن
(ریل گاڑی)

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جون 1968)

●●●

پارٹنر

گارفیلڈ ہارپر

اب وہ احاطے کے اندر تھا......

چاندنی رات میں سر ہاورڈ کی کوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے جیب سے جیبی ٹارچ نکالی اور روشنی کے محدود دائرے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

پورٹیکو کی طرف سے پہرے دار کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دیتی تھی: ''کڑاپ...... کڑاپ...... کڑاپ......''

وہ مسکرایا۔ کتنا عمدہ موقع ہے۔ آج پیٹر لارٹر کی زندگی کا سب سے حسین دن ہے۔

پیٹر لارٹر...... سمرسٹ کا مشہور ڈاکو جس کے نام سے بڑے بڑے کانپتے تھے۔ زندگی میں اس نے لاکھوں پونڈ کے ڈاکے ڈالے تھے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مجرموں کی لسٹ میں اس کا نام فریڈرک کرمزے کے بعد ہی آتا تھا۔ کرمزے ڈاکوؤں کا شہنشاہ! اور اس کے بعد لارٹر کا نام...... پیٹر لارٹر۔ برطانیہ کا سب سے خطرناک اشتہاری مجرم، جس کی گرفتاری کے لیے بہت بڑا انعام رکھا گیا تھا۔

وہ عجیب شخص تھا۔ انتہائی چالاکی سے ڈاکے ڈالتا۔ آج تک اس نے کوئی قتل نہیں کیا تھا۔ ڈاکے تو وہ یوں ڈالتا جیسے کوئی سیر کو نکلا ہو اور راستے کے پھول توڑ لے۔ آن کی آن میں تجوریاں خالی ہو جاتیں۔ بزنس مین منہ کھولے رہ جاتے...... فون کی گھنٹیاں بجتیں۔ ریڈیو کاریں اِدھر اُدھر دوڑتی رہتیں۔ اور لارٹر۔

......وہ کہیں بیٹھا اپنی جیت کی خوشی میں جام خالی کرتا رہتا۔

ڈاکے کے بعد وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے چیف کی خدمت میں ایک تحفہ بھیجتا۔ایک پارسل کھولنے پر اس میں صرف سرکا درد دور کرنے کی ایک ٹکیا نکلتی۔ چیف اس مذاق پر سر پیٹ لیتا۔کبھی تو جھنجھلا کر وہ ٹکیا کھا بھی جاتا تھا۔

پارسل کی بنیاد پر کافی دوڑ دھوپ ہوتی۔ڈاک کا پورا محکمہ اُلٹ پلٹ کر دیا جاتا لیکن بے سود!

اور آج ہاورڈ کی باری تھی۔وہ برطانیہ کا مشہور تاجر تھا۔اُسے کیا پتہ تھا کہ لارٹر آج اس کا مہمان بنے گا۔

لارٹر پائپ کے قریب پہنچ گیا۔اس نے جیب سے دستانے نکال کر پہن لیے۔پائپ کو چھو کر دیکھا۔بالکل ٹھنڈا تھا۔وہ چڑھنے ہی والا تھا کہ اُسے اُلو کی آواز آئی۔لارٹر ایک بار جھجکا...... انگریز سچ مچ بڑے وہم پرست ہوتے ہیں۔مگر پھر دولت کی اُمید نے اسے وہم کو جھٹکنے پر مجبور کر دیا۔اب وہ بڑی تیزی سے پائپ کے سہارے اوپر چڑھ رہا تھا۔بہت کم لوگ اس پھرتی سے پائپ پر چڑھ سکتے ہیں۔

اس نے چاروں طرف محتاط نظر ڈالی۔وہ ایک صحن میں کھڑا تھا۔اس نے جیب ٹٹولی۔سب کچھ موجود تھا۔اس نے بغل والے دروازے پر ہاتھ رکھا۔دروازہ یوں کھل گیا گویا وہ خود لارٹر کو اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔

''کڑاپ......کڑاپ۔'' پہرے دار کے قدموں کی آواز پہلے سے مدّھم سنائی دے رہی تھی۔جھینگروں کا شور بھی ماند پڑ گیا تھا۔

یکا یک اس نے آہٹ سی محسوس کی۔وہ فوراً صحن کے کونے میں دُبک گیا۔

یک بیک اس نے اپنے چہرے پر ایک سخت ہاتھ محسوس کیا اور پھر تو وہ گرتا ہی چلا گیا۔لیکن اُس نے پھرتی سے کام لیا۔اس کا ایک ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے اس سایے کے منہ پر چلا گیا۔اس نے مضبوطی سے اس کا منہ بند کر دیا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔لیکن اس کا حریف بھی کم زور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ایک ہاتھ ہوا میں لہرایا اور لارٹر کے چہرے پر سخت ضرب لگی۔لیکن وہ ہاتھ ہٹا نہیں۔اس نے لارٹر کا منہ بند کر دیا۔

لارٹر نے لگاتار دو تین گھونسے برسائے جو بالکل نشانے پر لگے۔سایہ لڑکھڑایا اور پھر زور میں

وہ لارٹر ہی پر آرہا۔

لارٹر کو بھی زمین چھوتے دیر نہ لگی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے۔ دونوں زور لگا رہے تھے...... لارٹر نے زندگی میں پہلی بار اپنی پیشانی پر شرمندگی کا پسینہ محسوس کیا۔ اس نے کافی زور لگایا لیکن سایہ اس سے بُری طرح چمٹ گیا تھا۔ دونوں فرش پر لڑھکتے رہے۔ کبھی لارٹر اوپر ہوتا کبھی سایہ! دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے منہ پر جمے ہوئے تھے۔ ایک بار لارٹر کو موقع ملا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر زور کا گھونسا حریف کو رسید کیا لیکن اُسی لمحے اُسے اپنی کنپٹیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اب پھر دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے سے چمٹے پڑے تھے۔ پہلی بار لارٹر کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اس نے پھر ایک ہاتھ سے حریف کو تڑا تڑ گھونسے برسائے۔ لیکن توبہ! اُس کے اُوپر تو گھونسوں کی بارش ہو گئی۔

اب وہ ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ اس نے پھر الگ ہونے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے ہاتھ پر کچھ گرم گرم محسوس کیا۔ اندھیرے میں اُسے کچھ سجھائی تو نہ دیا، لیکن بلاشبہ یہ خون تھا۔

دونوں میں سخت مکّے بازی ہونے لگی۔ لارٹر اور اس کا حریف دونوں پوری قوت سے لڑ رہے تھے۔ لارٹر نے اپنے منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی سخت کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ پھر اُس نے اپنے چہرے پر بھی خون بہتا ہوا محسوس کیا۔ اُس نے اپنے حریف کو تعجب سے دیکھا۔ لیکن صرف ایک کالا سایہ دکھائی دیا۔ اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کے حریف نے موقع ملنے پر بھی آواز نہیں بُلند کی تھی۔

اب آخری مقابلہ ہوا اور یہی سب سے زبردست بھی تھا۔ لارٹر نے خوب وار کیے، لیکن بے اثر وہ خود ہی بُری طرح تھک گیا۔ اسے اپنی ہار نظر آنے لگی۔ ایسی ہار جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی ہار ہوتی۔ وہ ہارنے کا نتیجہ جانتا تھا۔

یکا یک اُس نے سایے کو ڈھیلا پڑتا محسوس کیا۔ پھر کیا تھا۔ تابڑ توڑ حملوں سے اُس نے اسے سخت چوٹ پہنچائی۔ لیکن وہ خود کو بھی بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔

سایہ لڑکھڑایا اور پھر اوندھا گر گیا۔

لارٹر نے اپنے چہرے پر بہتے ہوئے خون کو صاف کیا۔ پسینے کی جگہ اب خون نے لے لی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ اُس نے جیب سے ٹارچ نکال کر بیہوش

آدمی کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس دلیر کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا، جس نے پیٹر لارٹر جیسے شخص کو مات دی تھی۔ اس بھاری بھرکم مضبوط آدمی کو سیدھا کرنا آسان کام نہ تھا اور پھر لارٹر کے لیے جو خود ہی غشی کے عالم میں تھا۔ آخر اسے کامیابی ہو ہی گئی۔ اس نے ٹارچ جلائی۔ بکھرے بال، خون سے لت پت چہرہ بند آنکھیں۔

''ار......!''

اس کے ہاتھ سے ٹارچ گر گئی۔ سامنے بالکل اندھیرا تھا۔ وہ ایک پتے کی طرح لہرایا اور ڈھیر ہو گیا۔

گشت کرنے والے چوکیدار کے قدموں کی آواز، جھینگروں کا شور...... سب بند ہو گیا۔

لندن اور سمرسٹ ہی کیا، سارے برطانیہ میں ہلچل مچ گئی۔ اخباروں نے خوب سُرخیاں جمائیں۔

''مشہور لیٹرے پیٹر لارٹر اور فریڈرک کرمزے سر ہاؤرڈ کی کوٹھی کے صحن میں پُراسرار حالت میں بے ہوش پائے گئے۔ دونوں خون سے لت پت تھے۔ گھر والوں کا بیان ہے کہ انھوں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ سر ہاؤرڈ بڑے خوش قسمت تھے...... کیونکہ اس دن انھوں نے کافی رقم بینک سے گھر منگوائی تھی۔

یارڈ کا چیف مارے خوشی کے اُچھل پڑا، اور اتنی زور سے اُچھلا کہ اس کا سر گنجی چھت سے ٹکرا گیا۔ بڑی چوٹ آئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے پیسوں سے سر کا درد دور کرنے کی ٹکیاں خرید کر کھائیں۔ اب تک وہ لارٹر کی بھیجی ہوئی ٹکیاں ہی کھاتا رہا تھا۔ خوشی کی بات بھی تھی۔ انگلینڈ کے دو مشہور لٹیرے ایک دن، ایک ہی جگہ بغیر کوئی نقصان پہنچائے پکڑے گئے تھے۔

جیل میں دو شخص آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

''تو تم......؟''

''تو تم......؟''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، اکتوبر 1966)

●●●

پکنک

شہلا تزئین

حقیقت یہ ہے کہ مضمون نویسی کا اس بندی کو ہمیشہ خاص شوق رہا ہے اور اس سلسلہ میں میں نے ایسے ایسے خوب صورت اور انوکھے مضامین لکھے ہیں کہ کلاس میں ہمیشہ تعریفیں ہوئیں۔ اُستانی صاحبہ ہیں کہ مضمون پڑھتی ہیں اور پڑھ کر پوری کلاس کو سنواتی ہیں دھڑا دھڑ گڈ اور ویری گڈ مل رہے ہیں۔ سہیلیوں پر ہماری قابلیت کا کچھ ایسا رعب بیٹھا ہے کہ بات کرتے ڈرتی ہیں، غرض یہ کہ پوری کلاس ہمیں ادیب مان رہی تھی۔ مگر برا ہو ہماری آپا اور بھائی جان کا کہ جو ہماری قابلیت کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ بات بے بات یہ ضرور بتا دیں گے کہ "خود کو تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ فیل ہو گی انشاء اللہ، سچ پوچھیے تو بات بھی یہی تھی کہ ہم نے جب کوئی مضمون لکھا۔ وہ ہمارا کم اور آپا اور بھائی جان کی کاوشوں کا نتیجہ زیادہ ہوا۔ اب اگر یوں میری کاپی میں دو چار اچھے مضمون جمع ہو گئے تھے تو اُستانی صاحبہ کو یا پوری کلاس کو غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ جب اُستانی کمر ٹھونک کر داد دیتیں کہ واہ کتنا اچھا مضمون لکھتی ہو تم، تو میں فوراً انکساری سے کام لے کر شرمانے لگتی گویا میں بھلا کس قابل ہوں (یہ تو سب آپا اور بھائی جان کا کمال ہے)۔

قسمت کی کرنی یہ ہوئی کہ اُستانی صاحبہ نے پکنک پر مضمون لکھنے کو دے دیا۔ چھوٹی سی تو کلاس تھی۔ اکثر کو تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یہ ہے کیا بلا۔ سب پریشان ہو کر رہ گئیں۔

"ہائے اللہ۔ یہ تو اتنا مشکل ہے۔ کیسے لکھیں گے۔"

دوسری بولیں "اور ہمارے گھر میں تو یہ ہے بھی نہیں۔"

مگر یہ لڑکیاں بھی ایک ہی وہ ہوتی ہیں۔ لپکیں میری طرف۔

"اللہ۔ تم بتادو نا بہن۔ تم تو اتنی قابل ہو۔"

"اچھی۔ شروع میں کیا لکھیں گے۔"

"ذرا دو چار باتیں بتادو ہمیں بھی۔ سبحان اللہ۔ یہاں ہمیں خود موت آئی جا رہی ہے اس تصور سے کہ اب پھر آپا اور بھائی جان کی خوشامدیں کرنی ہوں گی۔ فوراً کاپی کھینچ کر لکھائی میں مصروف ہوگئی۔

"بتادو بہن۔ کیسے لکھیں۔"

"اے۔ واہ۔ بھلا مجھے کیا آتا ہے۔" میں نے حقیقت بتائی مگر وائے قسمت کہ وہ اسے بھی انکسار سمجھیں بولیں۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ شروع کیسے کریں۔"

"قلم کاغذ لو اور شروع کر دو......" میں نے تیر بہ ہدف نسخہ بتایا۔

"اور ختم کیسے کریں۔"

"اس کے تو بہت سے طریقے ہیں۔" میں نے جان چھڑائی۔

"پھر بھی۔ ایک آدھ تو بتاؤ۔"

"واہ......کوئی ہنسی مذاق ہے یہ بھی کہ جھٹ سے بتادوں خوب سوچنا پڑتا ہے۔" یہ کہہ کر میں سر ہاتھوں میں لے کر سوچ میں پڑ گئی۔ ادھر لڑکیوں نے جو مجھے یوں سوچ میں غرق پایا تو آپ سے آپ اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ گھر گئی تو قرار کہاں۔ مضمون دوسرے ہی روز دکھانا تھا۔ اب کس سے لکھواؤں۔ اور کیوں کر لکھواؤں۔ آپا اور بھائی جان ہرگز اتنے مہربان نہیں کہ اتنے کم نوٹس پر لکھ کر دے دیں۔ یا اللہ اب تو ہی عزت رکھنے والا ہے میری! اسی فکر میں دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ جب اور کوئی حل نہ ملا تو پھر مجبوراً آپا کی جانب رجوع ہونا پڑا۔ دیکھا کہ آپا صحن میں لیٹی رسالہ پڑھ رہی ہیں۔ انتہائی خلوص و احترام سے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"اچھی آپا! پانی پلاؤں......" یہ خوشامد کی ابتدا تھی۔

"نہیں...... پیاس نہیں ہے۔"

"اچھا......تو پاؤں دبادوں۔" یہ انتہا تھی۔

''نہیں۔'' وہ اطمینان سے رسالہ پڑھتی رہیں۔

'' آپا...... ہماری پیاری آپا۔'' میں نے خواہ مخواہ گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ '' وہ بھی ایک ہی نبض شناس ہیں۔ پلٹ کر دیکھا اور بولیں '' کوئی کام ہے'' ''نہیں تو...... میں جھینپ گئی......'' '' تو پھر بھاگ جاؤ۔ پڑھنے دو۔'' بددل ہو کر بھائی جان کے کمرے کی طرف نکل آئی۔ وہ کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ بہت افسوس ہوا۔ مگر سوچا کہ کوشش کر کے دیکھ لی جائے اور کچھ نہیں تو شام کا وعدہ ہی لے لیں۔

'' آہا۔ بھائی جان کے یہ موزے کیسے پیارے ہیں۔''

''اور نہیں تو کیا۔ پانچ روپیہ کے لیے ہیں۔ ارے ہاں وہ ایک جوڑی ادھر میلی پڑی ہے ذرا دھو کے تو ڈال دینا۔'' یہ لیجیے۔ اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دبی زبان سے مدعا بیان کیا۔ '' بھائی جان۔ وہ ہمارا ایک مضمون لکھوا دیں گے آپ۔''

خفا ہو کر بولے۔ ''چلو چلو، اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس کہ تمھارے مضمونوں پر ضائع کرتے پھریں۔ خود لکھو بی بی خود...... عادت ڈالو...... اور ہاں وہ موزے......'' سائیکل سنبھالی اور یہ جا وہ جا۔

'' خود لکھو...... خود لکھو۔'' اچھا مشورہ ہے۔ کیوں لکھو۔ اور جو آتا ہی ہو تو پھر لکھ نہ ڈالیں۔

مایوسی کو بُرا سمجھتے ہوئے ایک بار پھر آپا کے حضور میں حاضر ہوئی۔ اپنے بستے میں سے رنگین پنسل نکال کر دکھائی۔

'' دیکھو آپا...... کیسی اچھی پنسل...... لیں گی......''

'' لے لیں گے......'' کس قدر احسان تھا مجھ پر۔ پھر مزید کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ چپ چاپ قلم اور کاغذ قریب رکھ دیا۔ دبی زبان سے کہا۔ '' آپا۔ وہ ذرا ایک مضمون......'' بات پوری بھی نہ سنی اور چیخ پڑیں۔ ''مضمون...... کون سا مضمون...... اُفو ہ ری لڑکی۔ تیرے تو مضمونوں نے جان عذاب میں کر دی میری۔ خود کیوں نہیں لکھتیں (وہی مرغے کی ایک ٹانگ) ''نہیں...... اچھی آپا۔ بس اس دفعہ اور......''

''جی نہیں۔ نہ اُس دفعہ۔ بس خود لکھو۔ میں تو شکایت لکھ کر بھیجوں گی اُستانی کے پاس کہ یہ پانچویں میں ہو گئی مگر سارے مضمون ہم سے لکھواتی ہے۔ فیل ہو گی انشاء اللہ! فیل ہو گی انشاء اللہ!

یہ آپا کا تکیہ کلام تھا جو وہ موقع بے موقع استعمال کرتی تھیں۔ میں بے حد جلی ''اچھا مت لکھ کر دو...... ہم بھی نہیں لکھتے......''

''مت لکھو......فیل ہو گی انشا......''

ایک تو بھوک لگ رہی تھی اوپر سے غصہ آ رہا تھا۔کاپی پھینک کر لیٹ گئی۔مگر پھر کچھ سوچ کر اٹھی کہ اگر آج مضمون نہ لکھا گیا تو کل بھری کلاس میں شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ساری 'ادبی' دھری رہ جائے گی۔اب ایسا بھی کیا۔لاؤ آج ہم خود لکھیں گے اور ضرور لکھیں گے۔آخر نہ لکھنے کی وجہ ہی کیا ہے کیا اللہ نہ کرے ہمیں آتا نہیں جو دوسروں کی خوشامدیں کرتے پھریں۔واہ اچھا فالتو کا سمجھ لیا۔فوراً ہی تاؤ آ گیا۔اور تاؤ بھی اس زور شور کا کہ اپنی کمر خود ٹھونکنے کو دل چاہنے لگا۔کئی بچوں کے رسالے نکالے اور اِدھر اُدھر کی کتابیں کہ شاید کچھ لکھا مل جائے مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔معلوم یہ ہوا کہ اس پکنک کے موضوع پر ہمیں ہی پہلی دفعہ قلم اُٹھانا ہے۔اچھا بھئی......جو مرضی اللہ کی۔مجبور بندہ اور کرے بھی کیا۔صبر و شکر کے ساتھ قلم اور کاغذ سنبھالا۔قلم میں بار بار روشنائی بھر کر دیکھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین خاتمے پر دغا دے جائے اور خیالات کا تسلسل بکھر جائے۔قلم کی نوک منہ میں دبا کر کئی پہلو ایک ساتھ بدل ڈالے۔خوب یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔اُٹھ کر بیٹھ گئی۔نہیں بھئی۔میز کرسی پر بیٹھ کر لکھیں گے میز کو جو گھسیٹا تو وہ خم کھا کر مجھ ہی پر نازل ہو گئی۔لاحول ولاقوۃ بمشکل اُس سے جان چھڑائی۔چلو بھئی فرش پر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اب سوچنا شروع کیا۔ہاں بھئی تو پکنک پر لکھنا ہے۔ارے بابا۔یہاں تو یہ موٹے موٹے چیونٹے پھر رہے ہیں۔اس سے تو وہ پلنگ ہی بھلا تھا۔اچھا تو پکنک پر لکھنا ہے۔بہت خوب۔تو......تو اب شروع کیسے کریں (وہی کم بخت سوال) اور پھر ختم......وہ کیسے ہوگا......ارے۔پہلے شروع تو کریں۔اچھا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بآواز بلند قرأت سے پڑھی بھی اور لکھی بھی تو۔ایک دفعہ سب بہن بھائی اپنے ابا جی کے ساتھ ملیر کے باغ میں پکنک کو گئے۔یہ دیکھا۔ہو گیا نہ آخر مضمون شروع۔اپنی اِس جرأت پر دل بہت ہی مسرور ہوا۔اچھا تو اب آگے۔وہ بہت ہی خوب صورت جگہ تھی۔بہت ہی اچھی سی جگہ تھی۔اتنی اتنی کہ......بس اب کیا بتائیں کہ وہ کس قدر اچھی تھی۔خیر تو ہم وہاں پکنک پر گئے۔جا کر بیٹھے۔سامان وغیرہ رکھا...... (خیالات کی آمد ملاحظہ فرمایئے) ایک دم سامنے سے آئس کریم والا گزرا تو میں نے بلا کر کہا کہ ایک

آنے والی آئس کریم دو۔ اُس کے بعد ہم نے فرش پر چادر وغیرہ بچھائی اور آرام کرنے لگے (یہاں پہنچ کر خود بھی پلنگ پر دراز ہو گئی)۔ یاد آیا ابھی کہاں آرام کیا۔ پھر تو شاہین لڑنے لگی کہ ہمیں بھی آئس کریم لے کر دو۔ کیا بتاؤں کیسی بدنیت ہے یہ شاہین کی بچی۔ ذرا جو صبر آ جائے۔ اونہہ۔ یہ کیا لکھنے لگی میں۔ لکھا بعد میں کاٹ دوں گی۔ تو آرام کرنے کے تھوڑی دیر بعد کھانے کا وقت ہو گیا۔ آپا نے اسٹو و جلایا کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی اور اس پر پراٹھے، کباب، قیمہ، بھرتہ وغیرہ گرم کرنے لگیں۔ سب نے خوب مزے لے لے کر کھایا۔ باغ میں سامنے ہی امرود اور کیلے کے درخت جھوم رہے تھے۔ اُنھیں دیکھ کر ہمیں خدا کی قدرت نظر آتی تھی کہ جس نے اتنے پیارے پیارے پھل پیدا کیے ہیں۔ اس کے بعد اپنی ایک آدھ شرارت بیان کی اور اُس کے فوراً بعد ہی چائے کا وقت ہو گیا۔'' آپا نے چائے بنائی (باورچی خانے سے اس قسم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں)۔ بھائی جان نے کیک اور بسکٹ کے ڈبے نکالے اور سب کو کھلائے۔ (یہ اپنے دل کی انتہائی معصوم خواہش تھی)۔ پھر ہم سب آپس میں کھیلنے کودنے لگے کہ اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا گاتا ہوا گذرا۔ ''چنا جور گرم بابو میں لایا مزیدار......!'' مجبوراً اس سے وہ لے کر کھائے۔ افوہ...... کس قدر مزہ دار مضمون لکھ رہی ہوں میں بھی۔ کل پوری کلاس مع اُستانی صاحبہ کے ہونٹ چاٹتی نظر آئے گی انشاء اللہ۔ اس کے بعد پھر اپنے کھیل کود کا تھوڑا سا اِسی قسم کا ذکر کیا۔ بہن بھائیوں سے جنگ کے مختلف مناظر کی چھوٹی سی جھلکیاں۔ غرضیکہ دو چار ایسے ہی حقیقت سے پُر واقعات قلم بند کیے تب جا کر دو صفحے پورے ہوئے۔ آخری جملہ لکھ کر بڑے آرٹسٹک انداز میں بڑا بڑا ''ختم شد'' لکھا اور نیچے مارے ارمان کے اپنے انتہائی خوب صورت سے دستخط بھی کر دیے۔ یہ لیجیے۔ اللہ اللہ اور خیر صلیٰ! بس اتنی سی بات تھی کہ جس کے لیے ہم آپا اور بھائی کے سامنے خوشامدی بن رہے تھے۔ ہشت۔ اپنی گزشتہ حماقتوں پر دلی افسوس ہوا۔ مگر میری اُس وقت کی حالت بھی قابل دید تھی جب اُستانی صاحبہ نے میری کاپی واپس کی اور میں نے اُس کے نیچے جلی حروف میں یہ لکھا پایا کہ ''مضمون دوبارہ لکھو مگر خدارا کھانا پہلے کھا لینا''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، مئی 1963)

●●●

ننھی منی کہانیاں

بچپن کی کہانیاں

شوکت پردیسی

نگاہوں سے کیسی اداسی عیاں ہے
کہاں ہے وہ بچپن، وہ بچپن کہاں ہے

کہاں ہیں وہ خوابوں کے لمحے سہانے
کھلونوں سے دل بستگی کے زمانے
وہ عہد مسرت کے دلکش فسانے

یہ کیوں فکر وغم اب مرے درمیاں ہے؟
کہاں ہے وہ بچپن، وہ بچپن کہاں ہے؟

وہ دنیا تو تھی شادمانی کی دنیا
شگوفوں کی دنیا، کہانی کی دنیا
کہاں ہے وہ اب لن ترانی کی دنیا

یہ کیوں زندگی اک سکوت گراں ہے؟
کہاں ہے وہ بچپن، وہ بچپن کہاں ہے؟

کہاں وہ گہوارۂ کیف و الفت
ہوئے کیا وہ خوشیوں کے لمحات شوکت!
مری جنت گم شدہ تھی حقیقت

مگر اب حقیقت بھی اک داستاں ہے
کہاں ہے وہ بچپن، وہ بچپن کہاں ہے

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، دسمبر 1973)

●●●

ماجد کی عقل مندی

فیروز بخت احمد

دہلی

ماجد کی عقلمندی

فیروز بخت احمد

ہفتے کا دن تھا۔ دوپہر چھٹی کی گھنٹی بجی تو ماجد اسکول سے سیدھا اپنے ابا جان کی دکان پر چلا گیا۔ بات یہ تھی کہ ہفتے کے دن ماجد کے اسکول کی چھٹی جلدی ہو جاتی تھی۔ وہ ایک بجے تک اپنے ابا کی دکان پر چلا جاتا تھا۔ اس کے ابا کی دکان صراف کی تھی۔ وہ سونے چاندی کی چیزیں بیچا کرتے تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے اور عادت کے نیک اور شریف تھے۔ سبھی لوگ ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ماجد بھی اپنے ابا کی طرح ہوشیار اور نیک تھا۔ دکان میں جا کر ماجد نے کھانا کھایا پھر اپنے ابا کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک گاہک آیا اور اس نے ماجد کے ابا سے ایک سونے کی گلدان دکھانے کو کہا۔ ماجد کے ابا نے ایک خوب صورت سی پھولدانی اس کو دکھایا۔

''جناب اس کی کیا قیمت ہے؟'' گاہک نے غور سے گلدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی قیمت آٹھ سو روپے ہے!'' ماجد کے ابا نے نرمی سے کہا۔ اتنی بھاری قیمت سن کر گاہک کچھ بھی نہیں بولا اور فوراً سو روپے کے آٹھ نوٹ ابا کو تھما دیے۔ ماجد کے ابا نے گلدان کو ایک اچھے سے ڈبے میں رکھ کر اس کے چاروں طرف سلی سے ایک پرانے اخبار کا کاغذ لپیٹ دیا۔ اس کے بعد وہ گاہک دکان سے باہر چلا گیا۔ ماجد بڑے غور سے یہ سب دیکھتا رہا۔ آخر ایک دن اسے بھی تو یہ کام سنبھالنا تھا۔ اس کے ابا نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ خوب اچھی طرح لکھ پڑھ لے گا تو وہ اسی کو دکان پر بٹھایا کریں گے۔

ہفتے کے بعد اتوار آیا۔ پیر کے دن ماجد کے اسکول کی چھٹی تھی۔ پیر کو ماجد دس بجے اپنے ابا کے ساتھ دکان پر چلا گیا۔ دکان کھولتے ہی اسی دن والا گاہک آیا جو گلدان لے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹا ہوا گلدانی کا ڈبہ تھا۔ اس نے ماجد کے ابا کے ہاتھ میں ڈبہ دے کر کہا "یہ لیجیے اپنا گلدانی اور میرے آٹھ سو روپے واپس کر دیجیے۔"

ابا نے کہا "ٹھہریے صاحب! ذرا میں آپ کے سامنے ڈبہ کھول کر دیکھ لوں۔"

گاہک نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے جلدی ہے۔"

ابا نے جلدی جلدی سے لپٹا ہوا اخبار ہٹایا پھر ڈبہ کھول کر گلدان باہر نکال لیا۔ گلدان کو دیکھتے ہی ماجد بولا "ابا یہ گلدانی ہمارا نہیں۔ یہ تو پیتل کا ہے۔"

واقعی گلدان نقلی تھا اور اس پر صرف سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ اندر سے وہ پیتل کا تھا۔ ماجد پھر بولا۔ "انھوں نے گلدانی بدل لیا ہے۔

گاہک چلایا۔ "نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں نے تو ڈبہ کھولا تک نہیں۔"

"دیکھیے صاحب! باتیں نہ بنائیے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ چپ چاپ ہماری چیز لوٹا دیں۔ کیا آپ کا یہی ایمان ہے۔ آپ۔ کو ایسا کرتے ہوئے خدا سے ڈر نہیں لگتا؟ ماجد کے ابا کو بھی تھوڑا غصہ آ گیا تھا۔

"دیکھو یہ تمھاری ہی چیز ہے۔ میں نے ڈبہ کھولا تک نہیں ہے۔" گاہک زور سے چیخا "دیکھیے صاحب تمیز سے بات کیجیے۔ غصہ کرنے کی اور چیخنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ ماجد کے ابا نے کہا۔

دکان کے باہر دس بارہ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے جب پوری بات سنی تو انھوں نے ابا کو پولیس بلوانے کی رائے دی۔ گاہک کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔

"ہاں ہاں بلواؤ پولیس کو میں بھی دیکھوں گا کہ پولیس کیسے ثابت کرے گی کہ میں نے ڈبے کو کھولا ہے۔" گاہک بولا۔

ماجد کے ابا بھی یہی سوچ رہے تھے کہ ان کے پاس کیا ثبوت تھا۔؟ ماجد عقلمند لڑکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس بات کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور ہونا چاہیے ورنہ پورے آٹھ سو روپے کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ غور سے اس اخبار کی طرف دیکھتا رہا جس میں گلدان لپٹا ہوا تھا۔ اچانک اخبار کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کو ثبوت مل گیا تھا۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ ابا نے

گلدان کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹا تھا جبکہ لپیٹا ہوا اخبار نیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھا کر دیکھا۔ مگر یہ کیا؟ اخبار تو کل کا تھا یعنی اتوار کا تھا۔ مگر ابا نے تو گلدان ہفتے کو بیچا تھا۔ تو پھر وہ ہفتے کو اتوار کا اخبار کہاں سے لائے۔ اتوار کا اخبار تو اتوار کی صبح کو ہی مل سکتا تھا۔ اب ابا یا تو گلدان کے ڈبے کو ہفتے کے اخبار میں لپیٹتے یا پھر ہفتے سے پہلے کسی دن کے اخبار میں لپیٹ سکتے تھے۔ اب ساری بات صاف ہوگئی تھی۔ اب ماجد نے اس بے ایمان گاہک سے پوچھا ''کیوں جناب! کیا یہ گلدان کا ڈبہ اسی اخبار میں لپیٹا ہوا تھا؟''

ہاں ہاں! تمھارے والد نے ہفتے کو یعنی دس تاریخ کو گلدان کے ڈبے کو اسی اخبار میں لپیٹا تھا۔'' گاہک نے تھوڑی گھبراہٹ میں کہا۔

''بہت خوب!'' ماجد ہنسا اب یہ بتایئے جناب کہ دس اکتوبر کو آپ نے گیارہ اکتوبر کا اخبار کہاں سے حاصل کیا؟ وہ اسے یا تو دس اکتوبر کے اخبار میں لپیٹ سکتے تھے۔ یا دس تاریخ سے پہلے کے اخبار میں وہ اس کو گیارہ تاریخ کے اخبار میں کیسے لپیٹتے؟ یہ دیکھیے یہ گلدان کا ڈبہ اسی گیارہ تاریخ کے اخبار میں لپیٹا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ آپ نے ڈبہ کھول کر گلدانی بدلا ہے۔ کھولنے میں شاید اخبار پھٹ گیا ہوگا تو آپ نے اسے کل یا آج گلدان بدل کر دوسرا اخبار لپیٹ دیا۔ آپ سے صرف اتنی سی غلطی ہوگئی ورنہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر ماجد نے گاہک کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئی تھیں۔ سب لوگ ماجد کی خوب تعریف کر رہے تھے۔

گاہک کو چوری قبول کرنی پڑی اور اس نے گڑگڑا کر ابا سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ آج سے ایسی بری حرکتیں کرنا چھوڑ دے گا۔ پھر اس نے ان کی اصلی سونے کی گلدانی واپس کر دیا۔ ابا نے اسے نصیحت کی اور پولیس کو نہیں بلایا۔ پھر گاہک نے قسم کھائی کہ وہ اب کبھی کوئی بری بات نہیں کرے گا۔ پھر وہ چلا گیا۔

(ماہنامہ ''جنت کا پھول''، رام پور، نومبر 1973)

●●●

پروفیسروں کے لطیفے

محمد ہاشم

پروفیسر حضرات کی غائب دماغی سے کبھی کبھی بے حد دلچسپ لطیفے جنم لیتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ لطیفے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان سے لطف اُٹھانے کے لیے آپ کا حاضر دماغ ہونا ضروری ہے۔

ایک پروفیسر سے ان کے نوکر نے کہا "جناب باہر آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"گدھے! تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں گھر پر نہیں ہوں؟" پروفیسر صاحب چیخے۔

"میں نے اُن سے کہا تھا، لیکن وہ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔" نوکر نے جواب دیا۔

"اُف خدا! کیسے بیوقوفوں سے پالا پڑا ہے۔ ٹھہرو! میں خود جا کر اُن سے کہہ آتا ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے پروفیسر صاحب گھر سے باہر نکل آئے۔

پروفیسر اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اُن کی بیوی اخبار لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کچھ سُنا آپ نے؟ اس اخبار میں آپ کی موت کی خبر چھپی ہے۔"

"اچھا!" پروفیسر صاحب نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "میری طرف سے تعزیت کا پیغام بھیج دو۔"

ایک پروفیسر صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے "میں نے کل بڑا ہی عجیب خواب دیکھا۔

میں نے دیکھا کہ میں کلاس میں ہوں اور لیکچر دے رہا ہوں اور جب میری آنکھ کھلی تو میں واقعی کلاس میں تھا اور لیکچر دے رہا تھا......!''

فلسفہ کے ایک پروفیسر نے اپنی بیوی سے کہا ''آج میں کالج چھتری لے جانا بھول گیا۔''

''پھر تو آپ کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی ہوگی؟'' بیوی نے پوچھا۔

''نہیں! بالکل نہیں!'' پروفیسر صاحب نے کہا ''بس بارش رُک جانے کے بعد جب میں نے چھتری بند کرنے کی لیے ہاتھ بڑھایا تو یاد آیا کہ چھتری تو میں گھر پر ہی بھول آیا ہوں..........''

ایک پروفیسر صاحب اپنی دُھن میں سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے اُن کا لڑکا فرّخ آرہا تھا۔ فرّخ سویرے ہی گھر سے نکل گیا تھا، اس لیے والد صاحب کو صبح کا سلام نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑے ادب سے کہا ''السّلام علیکم!''

پروفیسر صاحب چونک پڑے، اسے دیکھا اور بولے ''اوہ..........وعلیکم السّلام۔ کہو بھئی والد صاحب خیریت سے ہیں نا؟''

ایک پروفیسر اپنے کسی دوست کے یہاں گئے...... باتوں باتوں میں رات بیت گئی اور پروفیسر صاحب کو اس کا احساس نہ ہوا۔ ان کے دوست نے بھی تکلفاً ان سے کچھ نہ کہا۔ صبح سویرے جب ان کا نوکر انھیں بُلانے آیا، تو پروفیسر صاحب چونکے اور بولے ''بھئی معاف کرنا۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوں اور آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔''

ایک پروفیسر صاحب نے دل میں یہ ٹھانی کہ وہ اپنا ہر کام باقاعدگی سے انجام دیں گے۔ چنانچہ رات میں سونے سے پہلے انھوں نے اپنی تمام چیزوں کا اندراج ڈائری میں اس طرح کیا:

جوتے	:	پلنگ کے نیچے
کوٹ	:	کھونٹی پر
ٹوپی	:	میز پر
چھتری	:	دائیں طرف کونے میں
میں	:	بستر پر۔

اور اتنا لکھ کر وہ فوراً بستر پر لیٹ گئے۔

دوسرے دن صبح جب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو انھوں نے ڈائری کھولی۔ پہلے جوتے پہنے پھر کھونٹی پر سے کوٹ اُتار کر پہنا، ٹوپی سر پر رکھ لی اور ہاتھ میں چھتری تھام کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ ان کو خیال آیا کہ "میں" کہاں رہ گیا۔ دیکھا تو بستر پر بھی "میں" موجود نہیں۔ بہت پریشان ہوئے۔ آخر ایک کرسی پر بیٹھ کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ شام ہو گئی لیکن یہ معما حل نہ ہوا۔ پروفیسر صاحب نے پھر حسب معمول سب چیزوں کو قرینے سے رکھنا شروع کیا۔ یعنی:

جوتے : پلنگ کے نیچے

کوٹ : کھونٹی پر

ٹوپی : میز پر

چھتری : دائیں طرف کونے میں

اور آخر میں "میں"...... بستر پر!" کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئے۔

ایک پروفیسر صاحب کتابوں کے کیڑے تھے۔ ایک دن اُن کی بیوی نے انھیں ایک گلدستہ پیش کیا۔

"کیوں! آج کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

"اجی کیا بھول گئے؟ آج تمھاری شادی کی پہلی سال گرہ ہے۔" اُن کی بیوی نے جواب دیا۔

"اوہ اچھا، تو جس روز تمھاری شادی کا دن آئے مجھے یاد دلا دینا، میں بھی تمھیں گلدستہ پیش کروں گا......" پروفیسر صاحب یہ کہہ کر پھر مطالعے میں غرق ہو گئے۔

کلاس میں پہنچ کر پروفیسر صاحب کو خیال آیا کہ وہ چشمہ گھر پر ہی بھول آئے ہیں۔ انھوں نے پڑھانے کی بجائے سوال پوچھنے شروع کیے۔ بالکل پچھلی بینچ کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس سے متواتر کئی سوالات پوچھ ڈالے، لیکن اس لڑکے نے ہر سوال کے جواب میں کہا: "مجھے نہیں معلوم۔"

پروفیسر صاحب ایک دَم آگ بگولہ ہو گئے اور کہا: "نالائق! میں ابھی تمھاری رپورٹ پرنسپل

سے کرتا ہوں۔''

''کیانام ہے تمھارا؟'' پروفیسر صاحب نے قلم اور کاغذ سنبھالتے ہوئے غصے میں کہا۔

''میرا نام محمد باقر ہے اور میں اس کمرے کی وائرنگ ٹھیک کرنے آیا ہوں۔'' لڑکے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''ارے بیگم! پڑھتے پڑھتے کچھ سوچ کر اُٹھا اور پھر بھول گیا۔'' پروفیسر صاحب نے کہا۔

''کیا کسی دوست کے یہاں جانا تھا؟''

''نہیں!''

''تو پھر کیا کالج جارہے تھے؟''

''نہیں بیگم! آج تو اتوار ہے۔ وہ کچھ دوسرا خیال تھا۔''

''امّی پانی!'' اچانک پروفیسر صاحب کے ننھے لڑکے نے اپنے لیے پانی طلب کیا۔

''ہاں اب یاد آیا!'' پروفیسر صاحب ایک دَم چونک پڑے ''مجھے پیاس لگی ہے.....ذرا پانی لادو۔''

لیکچر ختم کرنے کے بعد جب پروفیسر صاحب نے لڑکوں سے سوال کیے تو کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ پہلے تو بے حد چراغ پا ہوئے پھر فوراً ہی کچھ یاد کرتے ہوئے بولے ''یہ کون سی جماعت ہے؟''

''بی۔اے!'' لڑکوں نے جواب دیا۔

''آئی ایم ساری۔'' پروفیسر صاحب نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ''میں سمجھا کہ میں ایم اے کی کلاس لے رہا ہوں۔''

پروفیسر صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ اسٹیشن پہنچے تو گاڑی چھوٹنے میں صرف چند منٹ کی دیر تھی۔ قلی کے سامان رکھتے رکھتے انجن نے سیٹی دے دی۔ پروفیسر صاحب بوکھلا اُٹھے انھوں نے جلدی سے بیگم کو ایک اٹھنّی پکڑا دی اور قلی کی بانہہ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے ڈبے کی طرف لپکے ''بیگم فوراً سوار ہو جاؤ، ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی جون 1968)

●●●

قسمت کا فیصلہ

م۔ع۔غم

شام سے جو بارش شروع ہوئی تھی اب رات کے بارہ بجے اس کا زور کچھ کم ہوا تھا۔شہر کے بہت سے حصّے اس مسلسل بارش کی وجہ سے بجلی کی روشنی سے محروم ہو گئے تھے۔مگر اس طرف کی الیکٹرک لائن محفوظ تھی، جہاں پروفیسر محمود کا بنگلہ تھا۔

پروفیسر محمود آج خلاف معمول ابھی تک جاگ رہے تھے لحاف انھوں نے اپنے سینے تک کھینچ رکھا تھا اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

دفعتاً اُن کو ایک جمائی آئی اور انھوں نے کتاب سرہانے میز پر رکھ دی۔ پھر انھوں نے لیمپ بجھا دیا اور گردن تک لحاف گھسیٹ کر لیٹ گئے۔تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی آہستہ سے چلتا ہوا اُن کے کمرے کے سامنے سے گزرا ہے۔ پاس والے کمرے میں ان کی بیوی اور ان کا دس گیارہ سالہ لڑکا سو رہے تھے۔لیکن اگر اُن میں سے کوئی ہوتا تو بغیر راہداری کی بجلی روشن کیے باہر نہ نکلتا۔ایسے حالات میں فوری طور پر چور کا تصوّر ہی ذہن میں آسکتا تھا۔انھوں نے میز پر سے وہ ٹارچ اٹھائی جو رات میں ہمیشہ اُس پر موجود رہتی تھی اور پلنگ سے اُتر آئے۔احتیاط سے انھوں نے ٹارچ روشن کی اور اس کا دائرہ چکراتے چکراتے ایک کونے میں میز پر رکھے ٹیلیفون پر پڑا۔وہ بے آواز قدموں سے ٹیلیفون تک پہنچ گئے۔نمبر ڈائل کر کے انھوں نے ٹارچ بجھا دی۔چند سیکنڈ کے بعد دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

''ہیلو۔کون صاحب ہیں۔میں انسپکٹر جمیل بول رہا ہوں۔''

''انسپکٹر میں پروفیسر محمود ہوں۔آپ فوراً پہنچیے۔چوری کا خطرہ ہے۔''''میں آرہا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب ملا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب پروفیسر محمود آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھے اور بغیر کسی آواز کے دروازہ کھول کر اندھیرے میں ہی باہر نکل آئے۔دفعتاً ان کو قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔پھر ان کو محسوس ہوا کہ کوئی اُن کے قریب سے گزر کر دوسری طرف جا رہا ہے۔ایک دم اُنھوں نے ٹارچ روشن کر لی۔مگر ٹارچ کی روشنی میں اپنے لڑکے مسعود کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ظاہر ہے تھوڑی دیر پہلے انھوں نے جس شبہ کے تحت انسپکٹر کو فون کیا تھا، اس کی وجہ مسعود کے علاوہ اور کوئی نہ رہا ہوگا۔مسعود بھی حیرت سے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔آخر پروفیسر نے پوچھا۔

''تم اندھیرے میں کیا کرتے پھر رہے ہو۔''

''پاپا۔مجھے پیاس لگی تھی اس لیے کمرے سے نکلا تھا۔پانی پی کر واپس کمرے میں جا رہا ہوں۔''

''پیاس۔سردی میں۔اور پھر تم نے بجلی بھی نہیں جلائی تھی۔'' پروفیسر کے لہجے میں غصہ تھا۔مسعود چپ رہا تو انھوں نے بدستور اسی آواز میں کہا۔''جاؤ اپنے کمرے میں۔آئندہ اندھیرے میں رات کے وقت مت نکلنا۔''

مسعود چلا گیا تو وہ اپنے کمرہ میں واپس جانے کے بجائے سردی کی پروا کیے بغیر شب خوابی کے لباس میں ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے کیونکہ انسپکٹر کو تو بہر حال آنا ہی تھا۔وہ سوچ رہے تھے کہ انسپکٹر کو اس وقت کی خواہ مخواہ کی دوڑ بھاگ ضرور گراں گزرے گی۔حالانکہ انسپکٹر جمیل سے پروفیسر کے گہرے مراسم تھے،مگر آدھی رات میں اور پھر بارش میں اُس کو اس طرح بلا وجہ دوڑنا ضرور بار گزرتا۔اگر اس کے پروفیسر سے تعلقات نہ ہوتے تو شاید وہ خود آنے کا وعدہ کرنے کے بجائے اپنے کسی اسسٹنٹ کو ہی بھیج دیتا۔

انسپکٹر جمیل کا مکان پروفیسر کے بنگلے سے تھوڑی ہی دوری پر واقع تھا اور بیچ میں تھانہ بھی پڑتا تھا۔اس لیے پروفیسر نے سوچا کہ اگر وہ آتے ہوئے اپنے ساتھ کانسٹیبل بھی لیتا آیا تو بات اور بھی بگڑے گی۔

ابھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ انسپکٹر کو کیا بیان دیں کہ باہر سے کسی نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ پروفیسر دروازے پر گئے اور روشنی کرنے کے بعد انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ آگے انسپکٹر جمیل اور اُس کے پیچھے دو کانسٹیبل تھے جنھوں نے ایک آدمی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ پروفیسر کو دیکھ کر انسپکٹر نے بغیر کسی رسمی گفتگو کے اُس شخص کی طرف، جس کو دونوں کانسٹیبل جکڑے ہوئے تھے، اشارہ کر کے کہا۔

''لیجیے پروفیسر۔ چور کو ہم لوگوں نے پکڑ لیا ہے۔''

''ایں'' پروفیسر کے اس 'ایں' کو نظر انداز کر کے مزید کہا۔

''جب ہم پہنچے تو یہ شخص آپ کے بنگلے کی دیوار پر دکھنی طرف کی گلی میں لگے پائپ کے ذریعہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ اگر یہ ہم لوگوں کو دیکھ کر پائپ سے ہی چپکا رہتا تو شاید گرفت میں نہ آتا، کیونکہ اُس حصّہ تک سڑک پر لگے بلب کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ مگر ہماری جیپ رکتے دیکھ کر اُس نے بھاگنے کی کوشش کی اور کامیاب نہ ہو سکا۔''

پروفیسر دم بخود سنتے رہے۔ انسپکٹر جمیل کہہ رہا تھا۔

''مگر پروفیسر۔ آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ میرے خیال میں آپ نے بنگلے کی کسی کھڑکی سے اس شخص کو اتنی رات گئے مشتبہ حالت میں دیکھ کر مجھ کو فون کر دیا ہوگا۔ کیوں ہے نا یہی بات؟''

پھر پروفیسر کو خاموش دیکھ کر فوراً ہی اُس نے متعجب لہجے میں کہا۔

لیکن پروفیسر آپ اتنے خاموش کیوں ہیں۔ کیا آپ کو چور کی گرفتاری سے خوشی نہیں ہوئی؟''

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔'' پروفیسر نے جلدی سے کہا'' دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو اتنی رات گئے بارش میں بھیگ کر آنے میں بڑی دقّت ہوئی ہوگی۔''

''کیا کہتے ہیں پروفیسر'' انسپکٹر نے کہا۔''فرض کی ادائیگی میں یہ بارش تو کیا طوفان بھی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔''

''اچھا تو اندر چلے آیئے۔ پانی میں بھیگنے کی وجہ سے آپ لوگوں کو اس وقت چائے یا کافی کی ضرورت ہوگی'' پروفیسر نے کہا۔

''نہیں پروفیسر۔ اب کافی رات ہو گئی ہے اور ابھی کچھ دیر کوتوالی میں لگ جائے گی۔ اس لیے

شب بخیر۔" انسپکٹر نے پروفیسر سے مصافحہ کیا اور کانسٹیبلوں کو اشارہ کر کے اپنی جیپ کی طرف مڑ گیا۔

حیرت زدہ پروفیسر محمود الیکٹرک پول کی روشنی میں کار کو دور ہوتے دیکھتے رہے!

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، دسمبر 1964)

●●●

تحفہ

فیروز بخت احمد

شکیل ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ پڑھنے میں تو وہ بہت تیز تھا۔ لیکن اس کی ایک عادت بہت بری تھی۔ بے حد سست اور کاہل تھا۔ اس وجہ سے کوئی کام بھی اس سے وقت پر نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح کو دیر سے اٹھتا، دیر سے نہانے اور ناشتہ کرنے سے فارغ ہوتا اور دیر سے ہی اسکول پہنچتا۔ اسی لیے وہ دن بدن پڑھائی میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ سستی کی وجہ سے وہ اسکول سے آتے ہی بستہ اور اسکول یونیفارم ادھر ادھر پھینک دیتا، گھر پر پڑھنے کے بجائے وہ ٹرانزسٹر لے کر بیٹھ جاتا اور گانے اور ڈرامے سنتا رہتا تھا۔ اسکول سے گھر میں کئی بار شکایت بھی آئی۔ اس کے ماں باپ بھی اس کی اس عادت سے پریشان تھے۔ انھوں نے اسے پیار سے بھی سمجھایا اور ڈانٹ ڈپٹ کر بھی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

کچھ دن کے لیے شکیل کے ماموں جان اس کے گھر آئے انھوں نے جو شکیل کا یہ حال دیکھا تو اس کو بہت سمجھایا بجھایا، مگر شکیل ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب ماموں جان نے یہ دیکھا کہ اس پر نہ پیار کا اثر ہوتا ہے اور نہ ڈانٹ کا تو انھوں نے سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے اس کی لت اپنے آپ ہی چھوٹ جائے۔ ان کو معلوم تھا کہ شکیل کی سالگرہ قریب آنے والی ہے۔ اور وہ اپنے ابا جان سے کئی بار ایک گھڑی لانے کو کہہ چکا ہے۔

ماموں جان نے شکیل کو بلا کر کہا "دیکھو تم اپنے ابا جان سے گھڑی دینے کے لیے کئی بار کہہ چکے

ہو۔وہ گھڑی دیں یا نہ دیں، اس سالگرہ پر تمھیں ایک بڑھیا سی گھڑی میں ضرور دوں گا۔"

ماموں جان کے منہ سے یہ بات سن کر شکیل کھل اٹھا اور بڑی بے چینی سے اپنی سالگرہ کے دن کا انتظار کرنے لگا۔ اس کو اپنی یہ سالگرہ سب سے زیادہ سہانی لگ رہی تھی، کیونکہ اس سال سے اس کو یہ ایک قیمتی تحفہ ملنے والا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو یہ تحفہ دکھا کر ان پر رعب جمانا چاہتا تھا۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ شکیل کی سالگرہ کا دن آ پہنچا دھیرے دھیرے چھوٹے بڑے تحفوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مگر شکیل کی آنکھیں تو اپنے ماموں کے تحفے کے انتظار میں تھیں۔ جب اس کے ماموں جان نے ایک چھوٹا سا مگر خوب صورت ڈبا اس کے ہاتھ میں تھمادیا تو وہ مارے خوشی کے تالیاں بجانے لگا۔ لیکن یہ کیا؟ ماموں جان نے اس کے اوپر لکھ دیا تھا: "یہ تحفہ سب کے سامنے نہ کھولا جائے۔" شکیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس گھڑی میں کون سی ایسی بات ہے کہ اس کے ماموں جان نے سب کے سامنے ڈبے کو کھولنے سے منع کر دیا ہے۔

شکیل کے لیے وقت کاٹنا بھاری ہو گیا۔ پارٹی جیسے ہی ختم ہوئی وہ دوستوں کو رخصت کر کے جلدی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ خوشی خوشی اس نے پیکٹ کھولا۔ مگر یہ کیا؟ پیکٹ میں اصلی گھڑی کی جگہ پلاسٹک کی کھلونا گھڑی رکھی تھی۔ ایسی گھڑی تو وہ خرید کر پچاس بار توڑ چکا تھا۔

"ہونہہ! کیا اسی گھڑی کے لیے انھوں نے مجھ سے اتنا انتظار کرایا تھا۔ انھوں نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ——— دھوکے باز کہیں کے!"

وہ منہ بسورتا ہوا اپنے ماموں کے پاس گیا "کیا آپ نے یہی گھڑی دینے کا وعدہ کیا تھا۔؟ یہ تو صرف بیس پیسے والی گھڑی ہے ایسی تو میں بہت سی گھڑیاں خرید چکا ہوں۔ مجھے تو اصلی گھڑی کی ضرورت تھی۔"

"یہ ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سست اور کام چور لڑکوں کے لیے بازار میں یہی گھڑیاں ملتی ہیں ——— اسی گھڑی سے تمھیں آرام بھی رہے گا۔ یہ نہ تو چلتی ہے اور نہ وقت بتاتی ہے۔ بس کام چوروں کی طرح ایک جگہ ٹکی رہتی ہے۔"

شکیل کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وار اسی پر کیا گیا ہے۔ وہ چپ چاپ اپنے ماموں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولے "اگر تمھیں اصلی گھڑی مل جائے گی تو نقصان تمھارا ہی ہوگا۔ وہ

گھڑی وقت بھی بتائے گی اور یہ بھی کہے گی۔ ''اٹھو اٹھو، تمھارے اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ پڑھنے کے وقت پڑھو سب ہی کام وقت پر کرو اور تمھارے بس کا یہ سب ہے نہیں۔ تم اب بہت آرام طلب ہو گئے ہو۔''

شکیل کا سر شرم سے جھکا جا رہا تھا۔

''پھر تمھیں اس گھڑی میں وقت پر چابی بھی دینی پڑے گی۔ اگر وقت پر چابی نہیں دو گے تو وہ گھڑی بھی اسی گھڑی کی طرح سست ہو جائے گی۔ اتنی مصیبت مول لینے سے تو بہتر یہی ہے کہ تم اسی گھڑی کو اپنے پاس رکھو۔ یہی گھڑی تمھارا ٹھیک طرح ساتھ دے گی۔'' ماموں جان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شکیل کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولا ''نہیں ماموں جان، میں اب ہر کام وقت پر کروں گا۔ کبھی کسی کام سے جی نہیں چراؤں گا۔ آپ مجھے چابی والی اصلی گھڑی لا دیجیے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں وقت پر ہی گھڑی کو چابی دیا کروں گا۔''

یہ سن کر ماموں جان نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''بیٹا سست اور کام چور آدمی بھی نقلی گھڑی کی طرح ہی ہوتا ہے جس طرح یہ گھڑی کسی کام کی نہیں ہے اسی طرح کام چور اور سست آدمی بھی کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اصلی گھڑی ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری زندگی کی ایک ایک گھڑی واپس نہیں آئے گی۔ اگر تم اصلی گھڑی چاہتے ہو تو تمھیں اس بات کو ہر لمحہ دھیان میں رکھنا ہوگا۔''

شکیل بولا ''ماموں جان، آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ وقت سچ مچ بہت قیمتی چیز ہے۔ اس کو برباد کرنا سب سے بڑی بیوقوفی ہے۔ میں آج سے اس قابل بننے کی کوشش کروں گا کہ آپ سے اصلی گھڑی حاصل کر سکوں۔''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، نومبر 1973)

●●●

راجہ ککڑوں کوں

غلام احمد فرقت کاکوروی

پُرانے زمانے میں ریاست کھا کھڑنگر میں ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا ظالم تھا کہ رعایا کو معمولی باتوں پر مُرغا بنا دیتا تھا اور گھنٹوں اُن سے مرغوں کی بولیاں بلواتا تھا۔ مُرغا بننے والوں میں اگر کوئی شخص مرغے کی بولی اچھی طرح نہ بول پاتا تھا تو راجا اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر خود مرغے کی بولی بول کر اُس سے کہتا کہ اس طرح کی بولی نکالے۔ روزانہ شام ہوتے ہی وہ یہ کام شروع کر دیتا۔ ریاست کے تمام مرغے اِن آوازوں کو سُن سُن کر بانگیں دینا شروع کر دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام ریاست میں رات بھر کے لیے لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اس لیے لوگوں نے اُن کا نام ''مرغا مہاراج'' رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے درباریوں کی اس سے رُوح فنا رہتی تھی اور وہ اُس کی خوشامد میں لگے رہتے تھے۔ وہ کہتا تھا ''مجھے پرندوں میں سب سے زیادہ مرغے کی بولی پسند ہے۔'' لہٰذا اُس نے اپنے اَمیروں اور درباریوں کو حکم دے رکھا تھا کہ جب وہ اس کی تعریف کریں تو بجائے تعریف کرنے کے مُرغے کی بولی بولا کریں۔ اسی لیے راجا جب کوئی اچھی بات کہتا تو تمام درباری زور سے ''ککڑوں کوں، ککڑوں کوں'' کرنا شروع کر دیتے۔ اگر راجا کوئی مشاعرہ کراتا تو سننے والے اچھا شعر سُن کر ''ککڑوں کوں، ککڑوں کوں'' کی آوازیں نکال کر شاعر کو اس کے کلام کی داد دیتے اور زمین آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ اس کی اس حرکت سے اس کے درباری بہت عاجز تھے۔

راجا کے دربار میں ایک مسخرا تھا۔ وہ راجا کا بہت منہ چڑھا تھا۔ اس کی ہر بات پر راجا بہت

خوش ہوتا تھا اور ''ککڑوں کوں، ککڑوں کوں'' کے نعروں میں اس کی تعریف کراتا تھا۔ راجہ کو سب سے زیادہ گدھے کی رینک سے نفرت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی جنم پتری میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تین چار مرتبہ اس کے سامنے گدھے کی بولی بول دے گا تو اس کا دم نکل جائے گا۔ چنانچہ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے ریاست کے تقریباً تمام گدھوں کو ملک بدر کرا دیا تھا تا کہ اُن کے رینکنے کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے، جو چار گدھے بچ رہے تھے اُس نے اُن کی زبانیں کٹوا دی تھیں۔ اس کی اس حرکت پر بے زبان گدھے اس کو دن رات کوستے تھے۔

ایک دن جب راجا اپنے دربار میں بیٹھا تو چاپلوسوں نے اس کی تعریف کرنا شروع کی۔ مسخرے نے کہا ''سرکار دنیا کے ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں جن کے سامنے فکریں اور مصیبتیں آتے ڈرتی ہیں۔'' درباریوں نے ''ککڑوں کوں، ککڑوں کوں'' بول کر مسخرے کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ لیکن راجا کو مسخرے کی یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ مسخرے کو فوراً مرغا بنا دیا جائے۔ راجا کا حکم دینا تھا کہ مسخرے کو مرغا بنا دیا گیا اور راجہ نے اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس سے مرغے کی بولی بلوانا شروع کر دی۔

بے چارے مسخرے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ راجا کیوں اس سے ناراض ہو گیا۔ جب وہ مُرغا بنے بنے تھک گیا تو اس نے راجا سے پوچھا ''حضور مجھ سے کون سی ایسی خطا ہوئی جس پر مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ راجہ نے کہا ''تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ راجہ کو جتنی فکروں اور مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اتنی مصیبتیں ایک معمولی درجے کے انسان کو پیش نہیں آتیں۔ اس وقت تمھیں چھوڑ دیتا ہوں۔ تم مرغا بنے گھر چلے جاؤ۔ کل تم کو اس کی باقاعدہ سزا دوں گا۔''

''یہ سُن کر بے چارہ مسخرا اسی طرح مُرغا بنے بنے اپنے گھر پہنچا۔ بیوی نے جب اس کو اس حالت میں آتے دیکھا تو ننگے پاؤں، ننگے سر دوڑتی ہوئی آئی اور پوچھا ''خدا خیر کرے، آج یوں کیسے چل رہے ہو؟''

مسخرے نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا ''راجا نے مرغا بنا رکھا ہے اور حکم دیا ہے کہ رات بھر اسی طرح گھر میں مرغا بنے رہنا، ورنہ اگر جاسوسوں کی زبانی معلوم ہوا کہ تم گھر پر لیٹ رہے تھے اور تم نے ہاتھ پاؤں سکوڑ لیے تھے تو تمھاری کھال کھنچوا لوں گا۔''

دوسرے روز سویرے سویرے مسخرا مرغا بنے بنے راجا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ راجا کو

جاسوسوں کے ذریعے اطلاع مل چکی تھی کہ اس نے رات بھر راجا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس لیے وہ مسخرے سے بہت خوش ہوا۔ اُس نے اپنے درباریوں کو شام کو ایک بہت بڑی دعوت دی اور اس میں اعلان کیا "میں مسخرے کی وفاداری سے بہت خوش ہوں اور انعام کے طور پر اُسے تین گھنٹے تک، جب تک یہ دعوت رہے گی، اپنی جگہ راجا بناتا ہوں۔" اُس نے سب درباریوں کو حکم دیا کہ وہ اتنی دیر تک مسخرے کا ہر حکم اسی طرح مانیں جس طرح اس کا حکم مانتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے اپنا تاج اور خلعت اُتار کر مسخرے کو پہنا دیا اور سامنے درباریوں میں اس طرح آ کر بیٹھ گیا گویا وہ بھی ایک درباری ہو۔ اس کے بعد اس نے تمام درباریوں سے کہا کہ وہ سب زور سے "ککڑوں کوں" کہیں۔ چنانچہ "ککڑوں کوں" کی آوازوں کے درمیان مسخرا تخت پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد مسخرے نے جو سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک بہت باریک بال سے بندھی ہوئی تیز تلوار اپنے سر پر لٹکتی دیکھی...... یہ دیکھ کر مسخرے کے ہوش وحواس غائب ہو گئے، راجا مسکرایا اور کہا "کہو میاں مسخرے، اب کیا کہتے ہو؟"

مسخرا جس کی تلوار دیکھ کر گھگھی بندھ گئی تھی، راجا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا "آپ مجھ کو معاف کر دیں اور مجھے مسخرا ہی بنا رہنے دیں۔ میں اب کبھی نہ کہوں گا کہ راجہ کی زندگی بڑے آرام کی زندگی ہوتی ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔"

مگر راجا کسی قیمت پر اپنا تاج واپس لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ مسخرے نے اپنا سر اور نیچے جھکا لیا۔ مگر وہ جتنا جتنا اپنا سر جھکاتا تلوار اتنی ہی اس کے سر کے قریب آتی جاتی۔ ہر لحہ اُسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب بال ٹوٹا اور اس کا سر کٹا۔

مسخرے کی منت سماجت کا جب راجا پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے "ڈھینچوں ڈھینچوں" کرنا شروع کر دیا۔ گدھے کی آواز سنتے ہی راجا بیہوش ہو گیا، اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ یہ دیکھ کر مسخرے نے بڑھ کر راجا کے کان کے پاس منہ لگا کر تین چار مرتبہ زور زور سے "ڈھینچوں، ڈھینچوں" کیا تو راجا کا دم نکل گیا۔

راجا کے مرتے ہی تمام درباریوں نے ایک ساتھ کہا: ککڑوں کوں!!!

●●●

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، مارچ 1966)

رکشے والا

عادل اسیر دہلوی

دیکھو! غریب کتنی زحمت اٹھارہا ہے
گلیوں میں بھیڑ والی رکشا چلا رہا ہے
محروم ہے اگر چہ دنیا کی نعمتوں سے
ہر بوجھ زندگی کا ہنس کر اٹھا رہا ہے
برسات میں بھی دیکھو پھرتا ہوا سڑک پر
رکشا بھی بھیگتا ہے خود بھی نہا رہا ہے
گرمی کی دھوپ میں بھی رکتا نہیں ہے گھر میں
پر پیچ راستوں کے پھیرے لگا رہا ہے
سردی سے کانپتا ہے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں
ٹھنڈی ہوا سے خود کو کیسے بچا رہا ہے
مستی میں دوڑتا ہے رکشا لیے سڑک پر
نغمہ کوئی سریلا اب گنگنا رہا ہے
رکشے کے پیڈلوں پر رکھے ہیں پاؤں دونوں
آنکھیں ہیں راستے پر گھنٹی بجا رہا ہے
ماں باپ منتظر ہیں گھر پر سبھی کے عادل
بچوں کو اب وہ لینے اسکول جا رہا ہے

●●●

شاہی شاعر

م۔ندیم

اگلے وقتوں میں جس شاعر کی رسائی شاہی دربار تک ہو جاتی تھی اور بادشاہ سلامت کو اس کا کلام پسند آجاتا تھا، یعنی جس کی تعریف میں بادشاہ زبان کھول دیتا تھا اس شاعر کو شاعرِ اعظم کا خطاب مل جاتا تھا، یعنی وہ درباری شاعر بن جاتا تھا۔ اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی تھیں، بادشاہ کی شان میں ایک قصیدہ پیش کر دیا، خلعت عطا کر دی گئی، اشرفیوں کی تھیلی ملی اور اس کے علاوہ ماہانہ یا سالانہ معقول رقم علاحدہ۔

ایک شاعر کی رسائی ان کی خوش بختی سے ایک شاہی دربار تک ہوئی اور وہ شاہی شاعر بن گئے۔ اب ان شاعر صاحب کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کسی دوسرے شاعر بھائی کی دال ان کے سامنے نہیں گلنا چاہیے، ورنہ ہو سکتا ہے کسی دن ان سے شاہی شاعر کا خطاب چھن جائے، کیونکہ بادشاہوں کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کسی بات پر ایک وقت خوش ہیں، مگر دوسرے وقت اسی بات پر ناراض اور کہنے والے کا پتا صاف!

چنانچہ جب بھی کوئی شاعر بادشاہ کے حضور میں کلام سناتا، تو شاہی شاعر صاحب فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے، ''جہاں پناہ گستاخی معاف، یہ شاعر نہ صرف زور ہیں بلکہ سینہ زور بھی ہیں، میرا ہی چُرایا ہوا کلام میرے سامنے سناتے ہیں اور میرے سامنے ہی محفل میں داد بٹورتے ہیں۔''

بے چارہ شاعر شرم اور غصّے سے ہکا بکا رہ جاتا اور شاہی شاعر ثبوت کے طور پر وہ کلام جیسے کا

تیسا محفل میں دہرا دیتے۔

یہی نہیں، ان کا غلام بھی اُٹھ کھڑا ہوتا، کورنش بجالاتا اور عرض کرتا، ''ظلِ الٰہی میرے آقا سچ فرماتے ہیں، یہ کلام میں نے ان کو بارہا پڑھتے سنا ہے، بلکہ یہ غزل مجھے تو اتنی محبوب ہے کہ میں نے اس کو زبانی یاد کرلیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو سنا بھی سکتا ہوں۔''

اور وہ غلام فرفر ساری غزل سناڈالتا۔ پھر ان کا دوسرا غلام اُٹھتا وہ بھی اسی قسم کے جملے دہراتا اور غزل آنکھیں بند کر کے سناڈالتا۔ بے چارے نئے آنے والے شاعر کو بڑی ذلّت اُٹھانا پڑتی اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلتا۔

اسی طرح بہت دنوں تک شاہی شاعر کا کام چلتا رہا، یہاں تک کہ اس کے پاس بادشاہ کی عنایت سے بہت سا مال جمع ہو گیا اب شاہی شاعر نے اعلان کرادیا کہ جو شاعر اپنا کلام بادشاہ کو سنائے گا، بادشاہ کو کلام پسند آنے کی صورت میں وہ خود اس کے دیوان کو سونے میں تول دیں گے، اور بادشاہ سے جو انعام ملے گا سو الگ، اور اگر کلام بادشاہ کو پسند نہ آیا تو سنانے والے شاعر کا دیوان شاہی شاعر جلوادیں گے۔ اب کسی شاعر کی ہمت نہ پڑتی تھی جو اپنا کلام بادشاہ کو سنائے۔

ایک دن ایک شاعر اپنے غلاموں کے سروں پر اپنے کلام کی کئی جلدیں رکھوائے ہوئے آئے۔ دربار میں بادشاہ سلامت تشریف فرما تھے۔ شاعر صاحب نے اپنا تعارف کرایا اور اپنا کلام پڑھنے کی اجازت چاہی، جو اُن کو فوراً مل گئی......

شاعر کا کلام بہت دل کش اور بلند تھا۔ شعر سناتے سناتے شاعر خاموش ہو گیا تو بادشاہ نے کہا، ''بھئی رُک کیوں گئے۔ بہت عمدہ غزل کہی ہے۔ سُنایئے سُنایئے۔''

''عالم پناہ۔ ابھی حکم کی تعمیل کرتا ہوں ذرا ایک بات کا فیصلہ چاہتا ہوں۔ میں نے صرف آدھی غزل پیش کی ہے۔ اگر کسی کو یہ دعویٰ ہو کہ یہ چوری کی ہے تو وہ بقیہ غزل بھی سنادے، ورنہ بعد میں دعویٰ غلط۔''

یہ سُن کر شاہی شاعر بہت سٹپٹائے۔ بادشاہ سلامت نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بولے، ''میرا خیال ہے یہاں کسی کو اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ یہ کلام چوری کا ہے۔ آپ شوق سے سنایئے۔''

شاعر نے غزل پوری کی، بادشاہ سلامت اور درباریوں نے خوب داد دی۔ مجبوراً شاہی شاعر کو بھی وہ کلام اس شاعر کا ذاتی تسلیم کرنا پڑا اور اس شاعر کے دیوان کو سونے میں تلوانے کی حامی بھرنا پڑی۔ مگر جب اس نئے آنے والے شاعر نے اپنے کلام کے دیوان کی پانچ جلدوں پر سے جزدان کو الگ کیا تو شاعرِ اعظم کو تارے نظر آ گئے۔

وہاں پانچ بھاری بھاری پتھر کی سلیں تھیں جن پر وہ پوری غزل لکھی ہوئی تھی۔

بادشاہ سلامت کو اس مذاق سے بہت لطف حاصل ہوا۔ اب نئے شاعر نے شاعرِ اعظم شاہی کی چالاکی بیان کی کہ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے، ایک بار سنے ہوئے کلام کو جوں کا توں دہرا سکتے ہیں ان کے دونوں غلاموں کی صفت یہ ہے کہ ایک تو دو بار سنے ہوئے کلام کو فوراً یاد کر لیتا ہے اور دوسرا تین بار سنے ہوئے کلام کو۔ اس نسخے سے شاعرِ اعظم یہ کاروبار چلا رہے تھے۔

بادشاہ نے پہلے والے شاعر کو نکال دیا اور تازہ شاعر کو شاہی شاعر بنا دیا۔ یہی نہیں پہلے کے شاہی شاعر کو ان پانچ بھاری بھاری سلوں کے برابر سونا بھی دینا پڑا۔ یوں بے چارے کی ساری کمائی شرط کی نذر ہو گئی۔ اور وہ شاعرِ اعظم سے شاعرِ مختصر ہو کر مرثیے کہنے لگے۔ تب سے مثل مشہور ہے:

''بگڑا شاعر مرثیہ گو''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، ستمبر 1966)

●●●

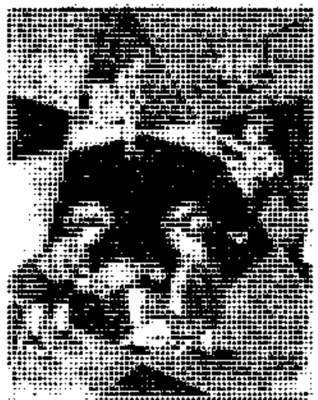

شریر بچوں کا مشاعرہ

وحشی مارہروی

ایک مکان کے احاطے میں دس بارہ بچے دری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کا منہ چڑھا رہا ہے کوئی کسی کا ہاتھ مروڑ رہا ہے، بچے سر ہلا ہلا کر اور کھانس کھانس کر بزرگوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں اور کچھ شور غل مچا رہے ہیں۔

چھنن خاں اپنی امی کے دوپٹے کی پگڑی باندھے اور ابا جی کی عینک آنکھوں پر چڑھائے ہوئے مکان سے باہر نکلتے ہیں۔ ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا ہے۔ بچے ان کو دیکھا اور زیادہ شور مچانے لگتے ہیں۔

چھنن خاں۔ حضرات! آپ بڑے نالائق معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ جہاں مشاعرہ ہوتا ہے وہاں شرارتیں نہیں ہوتیں۔ مہربانی کر کے خاموش ہو جایئے۔

(سب خاموش ہو جاتے ہیں)

چھنن خاں۔ کیونکہ یہاں کوئی بھی لڑکا مجھ سے زیادہ قابل نہیں ہے اس لیے صدارت کے صندوقچے پر بیٹھنا میرا حق ہے۔

(چھنن خان صندوقچے پر بیٹھنے لگتے ہیں ایک شریر لڑکا پیچھے سے صندوقچہ گھسیٹ لیتا ہے۔ اور چھنن خاں چاروں خانے چت گر پڑتے ہیں۔)

چھنن خاں (غصے میں بھر کر) یہ کیا بیہودگی ہے نامعقول کہیں کے۔ اب اگر ایسی حرکت کی تو

ڈنڈے سے سر توڑ دوں گا۔

لڈو میاں۔ ایسا کہیے چھنن صاحب جہاں مشاعرہ ہوتا ہے وہاں مار پیٹ نہیں ہوتی۔ صندوقچے پر تشریف رکھیے۔اور مشاعرہ شروع کیجیے۔

(چھنن خاں کپڑے جھاڑ کر صندوقچے پر بیٹھ جاتے ہیں اور جیب سے کاغذ نکال کر اسے غور سے دیکھتے ہیں۔)

چھنن خاں۔سب سے پہلے میں جناب بدھو میاں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے پاس کھڑے ہو کر اپنا کلام سنائیں۔

بدھو میاں: میرے خیال میں سب سے پہلے آپ کو اپنا کلام سنانا چاہیے۔

چھنن خاں۔(آنکھیں نکال کر) آپ بالکل بدھو ہیں۔

لڈو میاں۔اس میں کیا شک ہے۔

چھنن خاں: آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ صدر سب سے آخر میں اپنا کلام سنایا کرتا ہے۔

بدھو میاں۔آخر میں کیوں سنایا کرتا ہے۔

چھنن خاں یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔لیکن قاعدہ یہی ہے۔

بدھوں میاں۔جن کو یہ بھی نہیں معلوم ہو کہ صدر آخر میں اپنا کلام کیوں سناتا ہے ہم اسے اپنا صدر ہرگز نہیں بنا سکتے مہربانی کر کے آپ صدارت کے صندوقچے سے ہٹ جایئے۔

چھنن خاں۔(سب بچوں سے) حضرات، اگر آپ میں کوئی جانتا ہو کہ صدر آخر میں اپنا کلام کیوں سناتا ہے تو ہاتھ اٹھا دے۔

(کوئی ہاتھ اوپر نہیں اٹھاتا)

چھنن خاں (بدھو میاں سے) آپ خاموشی سے تشریف لے آیئے اور کلام سنانا شروع کر دیجئے ورنہ آپ کا کان پکڑ کر مشاعرے سے باہر نکال دیا جائے گا۔

(بدھو میاں منہ پھلائے اٹھتے ہیں۔اور چھنن کے پاس کھڑے ہوئے کر کہتے ہیں۔) بدھو میاں۔میں نے ایک بہت اچھی نظم لکھی تھی۔مگر صدر نے میری زبردست توہین کی ہے۔اس لیے میں اس وقت چار شعر سے زیادہ نہیں پڑھوں گا۔

بیکس: یہی بہت ہیں۔ ارشاد۔

سب بچے۔ ارشاد فرمایئے بدھو میاں، ارشاد فرمایئے۔

بدھو میاں:

شرارت سے اک روز تنگ آ کے میری چھڑی
ہاتھ میں لے کے بولیں یہ امی

چھنن خاں: کیا بولیں؟

بدھو میاں:

چلو بیچ آنگن میں بن جاؤ مرغا
کھجاتے ہوئے سر کو اپنے میں بولا
یہ وہ کام ہے جو نہیں میرے بس کا
ذرا سوچیے کیسے بن جاؤں مرغا
بدل ڈالوں کس طرح سے اپنا حلیہ
کہ رب نے مجھے آدمی ہے بنایا

بچے: واہ واہ! بہت خوب! کیا بات کہی بدھو میاں۔

چھنن خاں: اب حضرت بیکس اپنا کلام سنائیں گے۔

(بیکس صاحب اٹھتے ہیں اور چھنن خاں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

چھنن خاں (جھڑک کر) ادھر میرے سامنے کیوں کھڑے ہو۔ ادھر آ کر پڑھو۔

بیکس صاحب۔ بہت اچھا جناب سنیے

لڈو میاں: ارشاد!

بیکس صاحب: سنیے

اول تو میں بچہ ہوں پھر اس پر بیکس
ہر جھڑکی پہ سر اپنا جھکا لیتا ہوں

بچے: خوب خوب۔ بہت خوب

بیکس صاحب: آداب عرض کرتا ہوں۔

آگے سنیے:

جب مارتا کوئی زبردست مجھے

خاموشی سے دو اشک بہا لیتا ہوں

لڈو میاں: آپ تو سچ مچ بیکس ہیں۔

مٹھو میاں: بہت ترس آتا ہے آپ کی حالت پر۔

چھنن خاں بیکس سے۔ آگے ارشاد فرمائیے

بیکس صاحب: آگے کچھ بھی نہیں ہے میرا کلام ختم ہو گیا۔

چھنن خاں: پھر آپ کیوں کھڑے ہیں۔

بیکس صاحب: واہ واہ سننے کے لیے

(سب ہنس پڑتے ہیں)

چھنن خاں (جھنجھلا کر) واہ واہ واہ واہ آپ تشریف لے جائیے۔

بیکس صاحب اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔

چھنن خاں۔ اب جناب لڈو میاں تشریف لائیں۔

لڈو میاں جیب سے لڈو نکال کر کھاتے ہوئے چھنن خاں کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

لڈو میاں: ارشار فرماتا ہوں۔

چھنن خاں: آپ بالکل جاہل معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ارشاد فرماتا ہوں نہیں کہتے ہیں عرض کرتا ہوں کہتے ہیں۔

لڈو میاں: (ایک اور لڈو جیب سے نکال کر کھاتے ہوئے) آپ تو سچ مچ بہت قابل ہیں۔ اچھا صاحب عرض کرتا ہوں۔

بچے: پہلے لڈو ختم کر لیجیے۔

لڈو میاں: آپ کو میرے لڈو سے کیا مطلب

چھنن خاں: (لڈو میاں سے) یہ بدتمیزی ہے

لڈو میاں: بہت اچھا صاحب!

بچے ہوئے آدھے لڈو کو جیب میں رکھ لیتے)

لڈو میاں عرض کرتا ہوں۔

امرتی۔ قلاقند۔ لڈو۔ جلیبی

نہ پوچھو مجھے کس قدر ہے لبھاتی

بیکس صاحب۔ کچھ بتایئے۔

لڈو میاں: بس کچھ نہ پوچھیے۔

چھنن خاں: آگے ارشاد فرمایئے۔

لڈو میاں۔

مگر گھر سے ملتے نہیں اتنے پیسے

کہ کھاتا کبھی خوب ہی پیٹ بھر کے

ایک بچہ: افسوس۔ افسوس!

دوسرا: کل سے دو پیسے روز دے دیا کرو۔ چھنن خاں: کلام سن کر ایسی باتیں کرنا بری بات ہے واہ واہ کیجئے۔

(سب بچے واہ واہ کا شور مچانے لگتے ہیں۔)

لڈو میاں: آخری شعر سنیے۔

بچے: ارشاد۔

لڈو میاں:

یہی اب دعا ہے یہی اب تمنا

رہیں منہ میں دس بارہ لڈو ہمیشہ

چھنن خاں: آپ کا منہ ہے یا بھاڑ۔

لڈو میاں: ابھی آپ نے کہا تھا کہ کلام سن کر ایسی باتیں کرنا بری بات ہے۔ اور آپ ہی ایسی باتیں کرنے لگے۔ مہربانی کر کے واہ واہ کہیے۔

چھنن خاں۔ شرما کر) واہ واہ

سب بچے: واہ واہ ہاہاہا۔ بہت خوب واہ واہ (لڈو میاں اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں)

چھنن خاں: اب جناب شریر صاحب اپنا کلام سنائیں گے۔

(شریر صاحب اپنے دوست کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور لنگڑاتے ہوئے چھنن خاں کے قریب پہنچتے ہیں۔)

شریر صاحب: (چھنن خاں سے) آپ تھوڑی دیر کے لیے دری پر بیٹھ جائیں۔ میرے گھٹنے میں درد ہو رہا ہے۔ میں کھڑا ہو کر اپنا کلام نہیں سنا سکتا۔

(چھنن خاں پہلے تو کچھ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، پھر کچھ سوچ کر دری پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

شریر صاحب: (صندوقچے پر بیٹھ کر) عرض کرتا ہوں

سب بچے: ارشاد ارشاد۔

شریر صاحب:

بدا چھالا کھ درجہ بدنام آدمی سے
پچھتا رہا ہوں اب میں اپنی شرارتوں پر
اسکول اور گھر میں کوئی کرے شرارت
پھبتی ہے سر پہ میرے پڑتی ہے مار مجھ پر

سب بچے: واہ واہ۔ واہ واہ۔ بہت خوب کیا اچھی بات کہی ہے۔ ہاہاہا

شریر صاحب: میں چھنن صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے سہارا دے کر دری پر بٹھا دیں۔

چھنن خاں: ضرور۔ ضرور

(چھنن خاں شریر صاحب کو سہارا دے کر بٹھاتے ہیں)

چھنن خاں (صندوقچہ پر بیٹھ کر) اب میں آپ کو اپنا کلام سناؤں گا۔

بچے: ارشاد جناب۔ ارشاد!

چھنن خاں: چلیے اور سنیے!

بدھو میاں: واہ واہ۔ خوب خوب۔ بہت خوب۔

چھنن خاں: کلام سنے بغیر ہی تعریف شروع کردی۔

بدھو میاں: معاف کیجیے میں سمجھا کوئی شعر یا مصرع پڑھ دیا۔

چھنن خاں: ہونا بدھو!

بدھو میاں: بیشک!

چھنن خاں: عرض کرتا ہوں

رات کو میں نے خواب دیکھا
دیکھ کر اس کا چکنا چکنا سر
جی میں آئی لگے چپت اس پر
کھینچ کر ہاتھ پوری طاقت سے
جڑ دیا اس کی چکنی چندیا پے
کھل گئی آنکھ درد سے میری
منہ پر چانٹا پڑا تھا اپنے ہی

سب بچے مل کر: واہ واہ واہ۔ کیا مزے دار بات کہی ہے۔ بہت خوب۔

چھنن خاں: اچھا جناب اب ابا جی کے آنے کا وقت ہو گیا اس لیے مشاعرہ ختم ہوتا ہے آپ سب تشریف لے جائیں، اگلے جمعہ کو پھر یہیں مشاعرہ ہوگا امید ہے کہ آج کی طرح آپ اس مشاعرے میں بھی شریک ہوں گے۔ سب بچے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے ہیں۔

(ماہنامہ ''کھلونا'' دہلی، مئی 1947)

●●●

صلہ

اثر زیدپوری

داوا جان...... داداجان...... داداجان...... دادا..........'' سیٹھ ہاشم نے سامنے کھلی ہوئی کتاب سے نگاہیں موڑ کر آوازوں کی سمت دیکھا اور اُن کے چہرے پر خوشی کا نور بکھر گیا'' اُوہ! جاوید، رشو، نعیم تم......! ایسی قیامت کی ٹھنڈ میں کہاں نکل پڑے تم لوگ..........!'' کتاب بند کر کے انھوں نے مسہری پر سرہانے ایک طرف ڈال دی۔ آنکھوں پر چڑھی ہوئی عینک اتاری اور سینے تک پھیلا ہوا لحاف سرکا کر اُٹھنے لگے۔ اتنی دیر میں تینوں بچے اُن کی مسہری پر پہنچ چکے تھے۔ رشو جلدی سے لحاف کا کونا کھینچ کر اپنے داداجان کے ایک پہلو سے آلگی۔ جاوید ان سب میں بڑا تھا۔ وہ پھلانگ کر اُن کے دوسرے پہلو میں پہنچ گیا۔ نعیم نے داداجان کے دونوں پہلو آباد دیکھے تو وہ اچھل کر اُن کے گلے سے جھول گیا سیٹھ ہاشم ابھی سنبھل کر بیٹھ بھی نہ پائے تھے۔ نعیم کا اچانک بوجھ سہار نہ سکے اور دھم دھماکے کے ساتھ اُن کا سر تکیے سے پھر جالگا۔ تینوں بچوں کی ہنسی کے شور سے کمرہ گونج اُٹھا۔ خود سیٹھ ہاشم کا بُلند قہقہہ بھی اِن معصوم قہقہوں میں شریک تھا۔ ''شریر کہیں کا......!'' اُنہوں نے نعیم کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ رشو لحاف میں دبک کر اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ جاوید کے قہقہے بھی تیز ہو گئے اور نعیم تو ایسا خوش تھا جیسے ساری کائنات کا فاتح ہو۔ ''اب اترو بھی سینے پر سے!'' سیٹھ ہاشم نعیم کے پھول سے رخساروں کا پیار لے کر ہانپتے ہوئے بولے۔ اور نعیم نے دادا کے گلے سے باہیں نکال لیں۔

''داداجان،ہم سب آپ سے کہانی سننے آئے ہیں۔'' جاوید نے کہا،'' اور ہم بھی داداجان'' نعیم بھی جلدی سے بول اٹھا۔ اس کے چپ رہنے سے کہیں بات نہ بگڑ جائے۔

''بھئی، جتنی ساری کہانیاں مجھے یاد تھیں وہ سب تو تم لوگ کتنی ہی بار سُن چکے ہو۔ ایک ہی کہانی بار بار سننے کا فائدہ؟'' سیٹھ ہاشم نے کہا۔

''نہیں آج تو ہم نئی کہانی سنیں گے۔ اک دم نئی۔'' رشو اور نعیم ضد پر اُتر آئے اور اس معصوم ضد کے آگے سیٹھ ہاشم کو ہار ماننی ہی پڑی۔ ''اچھا سنو۔'' وہ مسکرا کر بولے'' آج میں تم سب کو ایک سچّا واقعہ سناتا ہوں جو کسی کہانی سے کم دل چسپ نہیں۔''

''ہا، ہا، ہا، تب تو ہم ضرور سنیں گے۔ ضرور سنیں گے۔'' رشو خوش ہو کر تالیاں پیٹنے لگی۔

''شور مت مچاؤ'' نعیم نے جاوید کے پاس سے سر اُبھار کر رشو کو ڈانٹ پلائی ''اچھے بچے چپ رہ کر سنتے ہیں۔'' رشو نے ہاتھ روک لیے۔ اُس کی مسکراتی آنکھوں میں چنگاریاں جھلملا گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ رشو نعیم کے خلاف محاذ سنبھالے سیٹھ ہاشم نے بیان شروع کر دیا۔

''بہت دن پہلے کی بات ہے۔ ایک شہر میں دو لڑکے رہتے تھے۔ وہ آپس میں گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک ہی اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ ان کے ماں باپ دولت مند نہ تھے۔ اپنے اسکول میں اُونچی حیثیت والے لڑکوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دونوں ہی اکثر سوچا کرتے، کسی طرح وہ بھی ایک دن بڑے آدمی بن جائیں۔ دونوں لڑکے............''

''داداجان اُن لڑکوں کے نام نہیں تھے؟'' نعیم سے چپ رہا نہ گیا۔

''ہاں ان لڑکوں کے نام بھی تھے۔'' سیٹھ ہاشم بتانے لگے رشو اور نعیم کہیں جھگڑنے نہ لگیں۔

''ایک کا نام تھا......'' اُسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور رضیہ کاندھوں پر پڑی ہوئی گرم شال سنبھالتی ہوئی اندر آ گئی۔ ''ارے! تم سب یہاں ہو!'' بچّوں پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی۔

''آپا کہاں، کہاں ڈھونڈ کر تھک گئی۔''

''ہم داداجان سے کہانی سُن رہے ہیں۔'' نعیم نے ماں کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

''چلو تم سب۔ داداجان آرام کریں گے۔''

''نہیں بیٹی۔'' سیٹھ ہاشم شفقت اور محبت سے مسکرائے ''میرے لیے یہ آرام کیا کم ہے کہ

میرے بچے مجھ سے قریب رہیں۔'' رضیہ مسکرادی۔ رضیہ چلی گئی تو سیٹھ ہاشم نے بیان کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ ''ہاں تو میں اُن لڑکوں کے نام بتا رہا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام تھا رفیق اور دوسرے کا نام..... اُس کا نام جمیل سمجھ لو۔''

''دادا جان یہی جمیل خالہ کا بیٹا؟'' رشو نے اپنی عقل مندی جتائی۔

''نہیں بیٹی'' سیٹھ ہاشم ہنسنے لگے۔ ''وہ دوسرا جمیل تھا۔ میں بہت پہلے کی بات سُنا رہا ہوں۔ اپنا جمیل تو تم سے بھی چھوٹا ہے۔''

''دادا جان! اس رشّو کو بھگا دیجیے!'' نعیم نے رشّو کے خلاف استغاثہ دائر کر دیا'' پٹر پٹر بولے جارہی ہے۔''

''دونوں ہی بھگا دیے جاؤ گے۔ اگر اب بولے!'' جاوید کو غصہ آ گیا۔ ''سُنتے ہو نہ سُننے دیتے ہو!''

''ہُنھ ......!'' رشّو بُرا مان گئی۔

''ٹھیک ہے بیٹی......!'' سیٹھ ہاشم رشّو کو سمجھانے لگے۔ ''بار بار ٹوکنے سے واقعے کا تسلسل خراب ہو جاتا ہے۔''

خبردار جو کوئی اب بولا......'' نعیم نے بڑے دبدبے سے حکم سُنا دیا۔

''دادا جان کہتے ہیں واقعے کا تسلسل خراب ہو جاتا ہے......''

جاوید کے ساتھ سیٹھ ہاشم بھی زور سے ہنس پڑے۔ صرف رشّو چُپ رہی آخر طے پا گیا کہ قصّے کے بیچ میں اب جو بھی بولا اُسے اس محفل سے اُٹھا دیا جائے گا۔ سیٹھ ہاشم بیان کرنے لگے۔

''ہاں تو رفیق اور جمیل دن رات یہی خواب دیکھتے کہ کسی طرح وہ بھی بہت سی دولت کے مالک بن جائیں۔ اُن دنوں کلکتے سے بھاری انعام کا معمّا نکلا کرتا تھا۔ جیسے اب ''شمع'' دہلی میں ہوتا ہے۔ ایک دن اُس معمّے کا ایک پرچہ رفیق کے ہاتھ آ گیا۔ اُس نے جمیل کو ترغیب دی کہ دونوں ایک ایک حل بھیج کر قسمت آزمائیں۔ جمیل کے پاس اپنے دو روپے تھے۔ رفیق کے پاس بھی کچھ پیسے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر پوری ذہانت اور محنت سے ایک ایک حل بنایا اور بھیج دیا۔ پھر لگے بے چینی سے نتیجے کا انتظار کرنے۔ دونوں جب بھی اکٹھے ہوتے اسی معمّے کی بات کرتے اپنے اپنے بھیجے ہوئے حل نکل آنے کے خواب دیکھتے یوں تو معمّہ والوں کی طرف سے اعلان

ڈیڑھ لاکھ کا تھا لیکن صحیح حل پر تو سے ہزار انعام تھا۔ "تو سے ہزار بہت ہوتے ہیں۔" جمیل سوچتا۔ اللہ پاک مہربانی کرے اور اس کا حل صحیح نکل آئے پھر تو ان کے گھر کی ساری مصیبتیں ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ قرض خواہ کتنا تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باپ پر دھونس جما جاتا ہے۔ مکان خالی کرا لینے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے...... اسکول اس کے گھر سے پُورا ڈیڑھ میل دور ہے۔ اُسے روز پیدل اسکول جانا پڑتا ہے۔ اُس کے پاس کپڑے بھی تو ڈھنگ کے نہیں ہیں۔ اُسے پہلا انعام مل جائے تو سب سے پہلے وہ اپنے باپ سے کہے گا کہ وہ یہ نوکری چھوڑ دیں۔ یہ گھر بھی چھوڑ دیں جس میں رہ کر ذلّت سہنی پڑتی ہے۔ وہ کوئی اچھا سا مکان خرید لے گا۔ اپنے لیے ایک بالکل نئی چمچماتی ہوئی سائیکل خریدے گا۔ چھوٹی بہن کے لیے اور اپنے لیے بھی اچھے اچھے کپڑے بنوائے گا۔ ماں باپ سے کہے گا کہ وہ بھی اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔ سب لوگ خوشی اور آرام سے رہیں گے۔

تعلیم مکمل کر کے وہ بھی کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹائے گا۔ نیت میں کھوٹ نہ ہو تو محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی...... اُسے بھی کاروبار میں ضرور ترقّی ہوگی پھر تو زندگی کی ساری خوشیاں ساری نعمتیں اُس کے لیے ہوں گی۔ اُس کے گھر والوں کے لیے ہوں گی۔

لیکن رفیق کے خیالات جمیل سے مختلف تھے۔ وہ کہتا۔ اُسے پہلا انعام مل گیا تو وہ ساری رقم اپنے نام سے بینک میں محفوظ کر دے گا۔ محض اپنی پسند یا ضرورت کی چیزیں خریدے گا یا پھر اپنی تعلیم پر خرچ کرے گا۔ وہ لندن جائے گا۔ امریکہ جائے گا اور جب وہاں سے اُونچی ڈگری لے کر پلٹے گا تو یہاں اُونچے عہدے کی کُرسی اُس کے انتظار میں ہوگی۔ وہ بڑا آفیسر بن جائے گا۔ شاندار بنگلے میں رہے گا اور کار اُڑائے پھرے گا۔

جمیل کو رفیق کے یہ خیالات پسند نہ تھے۔ ایسی خودغرضی بھی کیا کہ آدمی محض اپنی ہی آسائش کو سوچے۔ ماں باپ تک کو بھلا دے۔ رفیق کے خیالات اتنے گرے ہیں تو اُسے پہلا انعام بس مل چکا، خدا خودغرض کی کبھی مدد نہیں کرتا۔

دونوں اپنے اپنے طور پر سوچتے رہتے۔ اپنی اپنی ذہانت کے مطابق اُونچے اُونچے خواب دیکھتے رہتے۔ دن گزرتے گئے۔ انتظار کی بے چینیاں آخر ختم ہوئیں اور ایک دن نتیجہ سامنے آ گیا۔

رفیق کے گھر تار آیا تھا۔ اسے پینتالیس ہزار کی بھاری رقم انعام میں ملی تھی۔ پہلے انعام میں ایک شخص اور بھی رفیق کا شریک تھا اس لیے انعام کی مقررہ رقم دونوں میں برابر برابر بٹ گئی تھی۔ جمیل نے یہ خبر سُنی تو اُداس ہو گیا۔ اُسے اس بات کا دکھ کم تھا کہ اسے انعام نہیں ملا۔ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ خود غرضی نے نیک نیتی پر فتح پائی تھی۔ جمیل کو اپنے اب تک کے عقیدے کی بنیاد آج کمزور اور کھوکھلی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے سامنے خدا اور ایمان کی حقیقت کبھی دھندلی ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگتی کبھی روشن ہوتے ہوتے جگمگا اُٹھتی۔ جمیل کا ذہن شک اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی دنوں کی ذہنی کشمکش کے بعد جمیل فیصلہ کر سکا کہ وہ اپنے عقیدے کے محل کو گرنے نہ دے گا۔ کچھ بھی ہو اسے نیکی پر یقین مضبوط رکھنا چاہیے۔ ایک دن اسی یقین کی جیت ہوگی۔

دوسری طرف رفیق ساتھیوں میں اتراتا پھر رہا تھا ''ابھی کیا ہے آگے آگے میری ذہانت کا لوہا مانو گے تم لوگ! مجھے ہمیشہ سے اپنے ذہن کی برتری پر اعتماد رہا ہے۔ ایک دن میں بہت بڑا آدمی بنوں گا۔ بہت بڑا آفیسر۔ دنیا میرے قدموں میں سر جھکا دے گی۔ وہ تو کہو ایک منحوس نہ جانے کہاں سے بیچ میں آ کودا ورنہ نوّے ہزار پورے کے پورے اپنے ہوتے...... نہیں میں اپنا پیسہ کسی پر ضائع نہیں کر سکتا۔ پینتالیس ہزار کی رقم کون سی ایسی بڑی ہے۔ میرے سامنے ابھی اپنا سارا مستقبل پڑا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابا جان ادھر بہت تنگ دست، پریشان ہیں، لیکن کلرکی کر کے تو زندگی میں مصیبتوں کا سامنا رہے گا۔ کوئی کیا کر سکتا ہے...... ارے، ایک مزے کی بات سناؤں تمھیں۔ میرے نام کا تار دیکھ کر ابا جان بہت خوش ہوئے۔ میری پیٹھ تھپتھپا کر بولے ''میرا بیٹا نصیب کا دھنی ہے'' پھر کہنے لگے۔ ''یہ روپیہ آ جائے تو اپنا مکان چھڑا لیں گے۔ ساہوکار کے پاس کب سے گروی ہے۔'' میں نے صاف انکار کر دیا کہ ان فضولیات پر میں اپنا پیسہ ضائع نہیں کر سکتا۔ بہت حیران ہوئے بولے تم اسے فضولیات کہتے ہو! باپ دادا کے وقت کا مکان ہے۔ رہ جائے گا تو تمھارے ہی کام آئے گا مجھے ہنسی آ گئی اُن کی بات پر میں نے کہا ابا جان یہ بھی تو سوچیے...... امریکہ، لندن سے ڈگریاں لے کر آؤں گا تو میں بھلا اس ڈربے جیسے مکان میں رہوں گا......! میرا جواب سُن کر ایسا چپ ہوئے کہ پلک جھپکانا بھی بھول گئے۔

جمیل، رفیق کی یہ باتیں سُنتا تو جل کر رہ جاتا اُس کے دل میں رفیق کے لیے جو محبت تھی وہ

اب نفرت میں بدلتی جارہی تھی۔ جولڑکا اپنے ماں باپ کی بے چارگی کا مذاق اڑائے وہ بھلا کسی دوست یا ساتھی کے کیا کام آئے گا، جمیل کا دل رفیق سے دور ہوتا گیا۔ رفیق کو تار پائے چار دن ہو رہے تھے اور اب معمے کے دفتر کی طرف سے آنے والے تفصیلی خط کا انتظار تھا'' بھئی خط آ جائے تو تمھیں بتاؤں کہ معمأ والے تقسیم انعام کا جلسہ کب کر رہے ہیں۔ مجھے تو جلسے میں شرکت کے لیے کلکتے جانا پڑے گا۔ انعام کی رقم مجھے جلسے میں شریک ہو کر ملے گی۔ پہلا انعام پانے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے یہی کمپنی کا قاعدہ ہے۔ مجھے ابھی سے تیاری کرنی ہے۔ ایک کوٹ اور ایک پتلون کا کپڑا لے لیا ہے۔ زیادہ اچھا تو نہیں بس غنیمت ہے۔ محض کپڑے پر تیس روپے خرچ ہو گئے۔ درزی کی سلائی الگ سے ہوگی مجھے تو دوسرا ہی کپڑا پسند تھا لیکن اس کے دام زیادہ تھے۔ ابا جان راضی نہ ہوئے۔ کہنے لگے، اتنے ہی روپے نہ جانے کیسے دے رہا ہوں۔ اور ہاں، میری تصویر بھی یقین ہے معمأ والے شائع کریں گے۔ میں نے چند تصویریں اتروائی ہیں، دیکھنا تم سب بھی۔ جو سب میں اچھی ہوگی وہی بھیج دیں گے.....''

ایسی ہی بہت سی باتیں رفیق اور ساتھیوں کو سنایا کرتا۔ طرح طرح کے پروگرام بنایا کرتا۔ خوابوں کے محل سجاتا رہتا لیکن.....سیٹھ ہاشم رُک کر مسکرائے۔ رفیق کے خواب پورے نہ ہوئے۔ نہ تو معمے کے دفتر سے رفیق کے نام خط آیا۔ نہ اُس سے اشاعت کے لیے تصویر ہی مانگی گئی اور نہ اُسے انعام میں کوئی روپیہ ہی ملا۔''

''کیوں......؟ ایسا کیوں ہوا دادا جان......؟'' تینوں بچوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''اس لیے کہ......'' سیٹھ ہاشم مسکرا کر بولے۔ معمأ دفتر کے کارکن کی غلطی سے رفیق کے نام غلط تار آ گیا تھا۔ اصل میں انعام کا حق دار جمیل ہی تھا۔ اسی کا بھیجا ہوا حل صحیح تھا۔ رفیق کے حل میں تو بہت زیادہ غلطیاں تھیں۔ تار کی روانگی میں غلطی یوں ہوگئی کہ رفیق اور جمیل نے اپنے اپنے حل ایک ہی لفافے میں ساتھ ساتھ بھیجے تھے۔ جمیل کے حل پر صرف اس کا نام تھا۔ پتہ وہی تھا جو رفیق کا تھا۔ تار کا فارم بھرتے وقت دفتر کا کارکن بے خیالی میں جمیل کا نام نظر انداز کر گیا۔ بس غلطی ہوگئی۔''

''اور یہ غلطی ظاہر کیسے ہوئی؟ جاوید نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔''

''یہ بات اُس وقت ظاہر ہوئی جب معمے کا صحیح حل چھپ کر اخبارات میں آ گیا اور جمیل نے معمے

کے ذمہ داروں کو توجہ دلائی کہ اس کا بھیجا ہوا حل صحیح ہے۔ جانچ ہوئی تو غلطی کا راز کھلا ورنہ مقابلے کے ذمہ دار تو مطمئن تھے کہ تار جمیل کو گیا ہے۔ پھر دفتر کی طرف سے جمیل کو وہ خط بھی ملا جس میں اُسے جلسے میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اشاعت کے لیے اُس سے اُس کی تصویر طلب کی گئی تھی۔"

"تو دادا جان انعام کے روپے جمیل ہی کو ملے؟" نعیم نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! پینتالیس ہزار کی وہ رقم جمیل ہی کا حق تھی اور اسی نے پائی۔"

یہ تو بہت اچھا ہوا...... بہت اچھا!" رشو اور نعیم خوش ہو کر بولے۔ "جمیل کو ضرور انعام ملنا چاہیے تھا۔ وہ اچھا لڑکا تھا۔"

سیٹھ ہاشم کچھ دیر تک چپ چاپ مسکراتے رہے پھر بولے "بچو! کیا میں تمھیں بتادوں کہ وہ رفیق کون ہے؟"

"ہاں، ہاں بتائیے۔ وہ کون ہے؟" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔ "وہ تمھارے ہی رفیق چچا ہیں جو اکثر آتے رہتے ہیں۔"

"یہ رفیق چچا جو میونسپلٹی میں کلرک ہیں......؟" جاوید نے تصدیق چاہی سیٹھ ہاشم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ تینوں بچے چپ تھے جیسے یہ انکشاف انھیں پسند نہ آیا ہو۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر سیٹھ ہاشم ہی بولے "اب کیا تم جمیل کو بھی پہچانتے ہو......"

"ہاں...... ہاں...... جمیل کون ہے؟" سب بچوں نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"جمیل تمھارے سامنے موجود ہے۔" سیٹھ ہاشم مسکرائے "تمھارا یہی بوڑھا دادا۔"

"آپ!!" جاوید تو اتنا ہی کہہ کر رہ گیا لیکن رشو اور نعیم یقین نہ کر سکے "واہ آپ جمیل کیسے ہو سکتے ہیں آپ تو ہمارے دادا جان ہیں۔ آپ سیٹھ ہاشم ہیں۔"

"ہاں میرے گڈو!" سیٹھ ہاشم نے پیار سے دونوں بچوں کو لپٹا لیا، "میں تمھارا دادا جان ہوں۔ میں سیٹھ ہاشم بھی ہوں لیکن جمیل کے نام سے اپنے ہی ماضی کی کہانی تمھیں سنائی ہے۔"

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، اگست 1964)

●●●

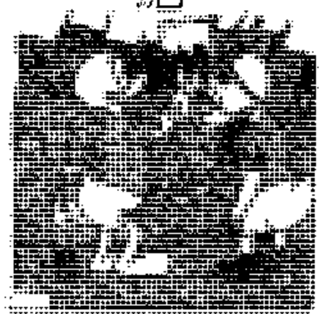

ہمیشہ الٹا رہنے والا جانور: سلوتھ

خلیل احمد

قدرت نے ایسے کئی جاندار پیدا کیے ہیں جن کی روزانہ زندگی اور ان کا برتاؤ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ انسان سن کر تعجب میں رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک تھن والا جانور سلوتھ ہے۔ یہ انوکھا جانور دکھنی امریکہ کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ سلوتھ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی کسی درخت کی شاخ پر الٹے لٹکے ہوئے گزار دیتا ہے۔ درخت پر لٹکی ہوئی حالت میں ہی پتیوں کو کھاتا ہے جو اس کی غذا ہے۔ شاخوں پر لٹکے ہوئے سوتا اور بچے پیدا کرتا ہے۔ اس کے دم نہیں ہوتی۔ اس کے دانت ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں۔ سلوتھ کی غذا صرف درختوں کی پتیاں ہی ہیں۔ اس کے ہاتھ اور پیر کا پنجہ لمبا ہوتا ہے جو درخت کی شاخ سے لپٹ کر ہک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

سلوتھ کی ایک نسل میں دو انگوٹھے ہوتے ہیں جبکہ ایک دوسری نسل میں تین انگوٹھے ہوتے ہیں۔ سلوتھ جب شاخوں پر الٹا لٹکا ہوا ہوتا ہے تو اس حالت میں بھی یہ اپنے سر کو چاروں طرف آسانی کے ساتھ گھما سکتا ہے۔ سلوتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے لیکن چل نہیں سکتا۔ لیکن کبھی کبھی سلوتھ کو درخت کے نیچے آنا پڑتا ہے تو اس وقت وہ نیچے آ کر پیٹ کو رگڑتے ہوئے تھوڑی دوری طے کر لیتا ہے۔ جب یہ الٹی حالت میں اپنے سر کو سینے پر رکھ کر سوتا ہے تو پورا جسم سوکھی ہوئی پتیوں کا انبار (ڈھیر) لگتا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کئی بار اپنے دشمن کے ہاتھوں شکار

ہونے سے بچ جاتا ہے۔اس کے پورے جسم پر ہرے رنگ کی کائی جمی ہوتی ہے جس سے اس کا رنگ پتیوں جیسا ہو جاتا ہے۔

سلوتھ اپنے دشمن کو پنجوں اور دانتوں سے کاٹ کر بھی نقصان پہنچاتا ہے۔عام طور پر سب ہی بال والے جانوروں میں بال جسم پر پیٹھ سے نیچے پیٹ کی طرف لٹکے رہتے ہیں۔لیکن قدرتی طور پر سلوتھ میں اس کا الٹا نظر آتا ہے۔اس کے جسم پر لمبے بال پیٹ سے پیٹھ کی طرف لٹکے رہتے ہیں۔ایسا ہونے سے تیز بارش کا پانی بھی نیچے گر جاتا ہے کیونکہ یہ الٹا لٹکا رہتا ہے۔سلوتھ کے جسم کے مختلف عمل بہت دھیرے ہوتے ہیں،جس کی وجہ سے جسم کی توانائی (طاقت) کم خرچ ہوتی ہے۔اسی وجہ سے یہ پوری زندگی صرف پتیاں کھا کر گزار دیتا ہے۔

سلوتھ نر اور مادہ کا ملنا بھی درختوں پر الٹی لٹکی ہوئی حالت میں ہوتا ہے چار چھ مہینے کے بعد ایک بار میں عام طور ایک ہی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ماں اسے ملائم بالوں میں چھپا کر پرورش کرتی ہے۔سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ایک سلوتھ کی عمر عام طور پر بارہ سال ہوتی ہے۔

(ماہنامہ ''گل بوٹے''،ممبئی،جولائی 2008)

●●●

صلح نامہ

شکیل انوار صدیقی

"امّی، دیکھیے۔"

"اف او..... نجو، خدا تجھے سمجھے۔" شکیل نے کرسی سے کود کر اُس کا منہ دبا دیا۔

"میں تو آج امّی سے ضرور کہوں گی کہ بھیا روز حلوہ کھا جاتے ہیں۔ یہ پوی ووی....."

"اے ذرا آہستہ بول نا، تُو بھی کھا لینا۔" اور شکیل نے ایک چمچ بھر کے اس کے منہ میں ڈال دیا۔

"بھیا حلوہ، ہے تو مزے کا..... مگر یہ جو میری پوی کو سزا ملی ہے نا، بس میں تو ذرا امّی کو یہ بتا دوں کہ حلوہ پوی نہیں بھیا چٹ کر جاتے ہیں کہہ آؤں نا۔" نجمہ نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں، امّی سے بھی کہنا اور پاپا سے بھی..... اور جانتی ہے کمر کس کی ٹوٹے گی..... اوں۔"

"کمر.....؟"

"ہاں! کمر اور کہو تو سر بھی۔"

"خیر وہ تو جب امّی کو معلوم ہوگا کہ حلوہ بھیا کھاتے ہیں..... تو ظاہر ہے، کس کی ٹوٹے گی۔"

"البتہ سر تیرا ضرور ٹوٹ جائے گا۔" شکیل دانت پیس کر اس کی طرف بڑھا اور نجمہ ڈر کے مارے بولنا تک بھول گئی۔

"کیوں..... اب بول کہے گی امّی سے۔" شکیل نے اس کی چوٹی اینٹھی۔

''دیکھو......آ......آ......بھیا تم مارلو مگر یاد رکھو میں امّی سے ضرور کہوں گی۔''

''کہہ گی......''

''ضرور کہوں گی......کہوں گی......کہوں گی......آ آ......آ......''

''کہہ گی......اوں، اور گھماؤں۔''

''ہاں ہاں تین دفعہ جو کہہ دیا۔'' نجمہ بدستور کہے جا رہی تھی۔

'اف اوری بے حیا'' شکیل نے جی میں کہا۔ اس کا ہاتھ خود دکھنے لگا تھا اس نے سوچا اگر واقعی نجو نے امّی سے کہہ دیا تو یہ روز روز کا حلوہ وغیرہ جتنا کھایا ہے سب نکل جائے گا مار کے راستے۔ مگر اب اس نجو کی بچّی کو منائے کس طرح اب تو یہ ضرور کہے گی بھلا اتنی مار کے بعد بھی نہ کہے......پھر وہ کچھ سوچ کے بولا۔

''اچھا نجو کیا واقعی تم امّی سے شکایت کرو گی'' شکیل کچھ نرم ہوا۔

''اور نہیں تو کیا، بس دیکھتے جاؤ، سب کہوں گی ذرّہ ذرّہ برابر، ہوں تم نے سمجھا کیا ہے۔'' نجمہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اور شکیل کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ یہ تو کچھ نہیں ہوگا اگر نجو نے شکایت کر دی، اس نے جلدی سے اس کا راستہ روک لیا۔

''جانے دو نا مجھے......'' نجمہ نے اسے راستے سے ہٹانا چاہا۔

''دیکھو نجو، تم ہماری بہن ہونا، تو بس امّی سے شکایت نہیں کرو گی۔''

''ہوں......تم ہماری بہن ہونا، آ گئے اپنی اصلیت پر، اُس دن جو تم نے چاکلیٹ نہیں دیے تھے۔''

''ارے بس اتنی سی بات......لو اب لے لونا......مگر ہاں امّی سے مت کہنا۔ اوں۔''

''ارے جاؤ، کبھی دیے بھی ہیں۔'' نجمہ نے منہ چڑایا۔

''نہیں واقعی......چلو ابھی لے لو'' شکیل اپنے کمرے میں گھس گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا پورا ڈبہ تھا۔

''لو......اور ہاں اب بھی امّی سے شکایت کرو گی۔''

''ارے نہیں بھیا کیسی باتیں کرتے ہو......اتنے اچھے بھیا تو......''

''اچھا بس رہنے دو......جاؤ چلو'' شکیل کو اطمینان ہو گیا، چلو آئندہ کے لیے بھی طے۔ اس

نے ادھر اُدھر دیکھا امّی اب بھی لان پر بیٹھی ہوئی پاپا کا سوئٹر بن رہی تھیں اور باجی اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا اور تھوڑا سا حلوہ منہ میں ڈال کر جلدی سے باہر نکل آیا اسے ڈر تھا کہ نجمہ پھر نہ آ جائے لیکن نجمہ نہیں آئی، وہ اپنے کمرے میں بڑے اطمینان سے چاکلیٹ چبا رہی تھی۔

اب یہ تو بڑی مشکل تھی کہ وہ روز نجمہ کے لیے چاکلیٹ لائے اور چاکلیٹ ہی کیوں، نجمہ تو اب مستقل اس کو بلیک میل کرنے لگی تھی، کہتی:

''بھیّا...... دیکھنا وہ نور کی بلّی کتنی اچھی ہے، ہماری پوسی بھی تو اتنی اچھی تھی۔ مگر تم تو اسے اتنی دُور چھوڑ آئے۔''

''ارے تو میں کیا کروں...... امّی سے کہو...... میں خود چھوڑ کر آیا ہوں۔'' وہ جھلا اُٹھا۔

''وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، کہ میں امّی سے کہنے جا رہی ہوں کہ حلوہ پوسی نہیں بھیّا۔''

''ارے ارے...... نجو اتنی جلدی بھول گئیں۔ الماری میں سے چاکلیٹ نہیں لے لیے۔'' وہ بات بدلتا۔

''نہیں بھیّا...... اب بھلا اتنے سارے چاکلیٹ میں کیا کروں گی...... ایک دن میں تو کھانے سے رہی۔''

''تو پھر اور کیا لوگی......''

''ارے بھیّا...... اب تم انکار کرنے سے تو رہے، بس میری گڑیا کے لیے تھوڑا سا زیور لا دو۔''

''بس اچھا۔ اچھا جاؤ...... جلدی سے امّی سے کہہ آؤ کہ بنّی بھیا حلوہ''

''میرے بھیّا''...... اس نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

یہ روز ہی ہونے لگا۔ شکیل کبھی بالکل طے کر لیتا کہ آج وہ فیصلہ کر ہی لے گا۔ بھلا اتنے سے حلوے کے لیے چاکلیٹ بھی لا کر دے، گڑیا کا زیور بھی لا کر دے...... حد ہو گئی صاحب، مگر جب امّی کی مار کا خیال آتا، اور حلوے کا بائیکاٹ ہوتا نظر آتا...... تو وہ ایک دم سرد ہو جاتا۔ اب کرتا بھی کیا؟

ایک دن اسکول سے آتے وقت وہ سوچ رہا تھا ''امّی نے اس مرتبہ تو بہت ہی لذیذ حلوہ بنایا ہے۔ ارے ہاں آج تو امّی بھی خالہ جان کے یہاں گئی ہوں گی۔ واہ! کیا مزے کی بات ہے۔'' اس کی زبان چٹخارے لینے لگی۔ مگر کمرے کی چابی۔ ارے وہ وہیں ٹھٹک گیا۔ وہ تو شاید اپی (باجی) کے پاس ہوگی۔

اب......؟ اس کا تمام جوش ختم ہو گیا۔ تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم دھیمے ہو گئے۔ گھر میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب سے پہلے امّی کے کمرے پر پڑی۔ وہ پہلے تو مایوس سا ہوا مگر ایک دم اس کی آنکھوں کی چمک کچھ بڑھ سی گئی۔ امّی کے کمرے کا تالا بند نہیں تھا، کواڑوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تو وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا، قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کواڑوں کو دھکا دیا۔ کواڑ کھل گئے اسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ کتابیں بھی رکھ آتا، وہ تو بس جلدی سے کمرے میں گھس گیا۔ مگر یہ کیا، وہ آج یہ کیا دیکھ رہا ہے۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ اور کرسی پر چڑھی ہوئی نجمہ ڈش میں سے حلوہ کھا رہی تھی۔

''کیوں بڑی بی۔'' اس نے نجمہ کے بالکل قریب پہنچ کر کہا۔ نجمہ لرز گئی اور چمچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''کہوں اپی سے جا کر۔'' اس نے نجمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور لگا دروازے کی طرف کھینچنے۔ وہ غریب پہلے ہی گھبرا رہی تھی، اب اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''بھیا......'' اس نے معصوم نظروں سے شکیل کی طرف دیکھا ''تم اپنے تمام چاکلیٹ مجھ سے لے لو، مگر بھیا......خدا کے واسطے اپی سے مت کہو......دیکھو بھیا۔'' نجمہ اب باقاعدہ رونے لگی۔

''اوں......اچھا پہلے یہ روں روں تو بند کرو۔'' اور نجمہ نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔

''ہم بتائیں......ایسا کرو......مگر نہیں......تم نے تو اس بار بہت پریشان کیا ہے، میں نہیں جانتا، چلو اپی کے پاس۔''

''اچھا چلو......میں بھی سب کہہ دوں گی۔'' نجمہ بھی اکڑ گئی۔

شکیل مُسکرایا۔ وہ تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا۔

''نہیں......ایسا کریں کہ ہم صلح کر لیں اور پھر دونوں کسی کی شکایت نہیں کریں گے۔''

''آں......ہاں......''

''اچھا تو لاؤ۔ ایک چمچہ حلوہ مجھے اپنے ہاتھ سے دے دو۔'' شکیل سے اب صبر نہیں ہوا۔ دونوں میں طے ہو گئی......اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان کی یہ صلح اسی طرح قائم رہی تو یقیناً امّی کا کمرہ......خطرے سے خالی نہیں۔

●●● (ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جنوری 1960)

صورت اور سیرت

شمسہ بنتِ اخضر

انور اسلم کے ساتھ کلاس سے نکلا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اُس کے شانے پر بڑی بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ مڑ کر دیکھتا کہ کون ہے، شمیم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی،

''انور! پیر کو یعنی پرسوں میری سالگرہ ہے۔ ضرور آنا۔ مَیں تمھارا انتظار کروں گا۔''

''لیکن شمیم، مجھے بہت افسوس ہے۔ شاید میں تمھاری سالگرہ کی پارٹی میں شریک نہ ہوسکوں۔'' انور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟ آخر وجہ نہ شریک ہونے کی؟'' شمیم نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

''وجہ تو کوئی خاص نہیں۔ بس میں آنہ سکوں گا۔'' انور کے ایک ایک لفظ سے اُداسی جھلک رہی تھی۔

''اگر کوئی وجہ نہیں تو پھر میں یہ سمجھوں کہ تمھارا دل ابھی تک میری طرف سے صاف نہیں ہے۔ اِسی لیے تم میری خوشی میں شریک ہونے سے انکار کر رہے ہو۔ شمیم نے کسی قدر تُرش لہجے میں کہا۔

''شمیم! خدا کی قسم ایسا نہ سوچو۔ میرا دل تمھاری طرف سے شیشے کی طرح صاف ہے اور اگر تمھیں یقین نہیں تو جو چاہو سزا دے لو۔ میں اُف بھی نہیں کروں گا۔ مجھے تو تمھارا شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ تم مجھ ایسے غریب اور بدصورت پر کس قدر مہربان ہو۔ کاش شمیم تم نے یہ بات کہنے سے پہلے غور کیا ہوتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نہیں جانتے شمیم مجھے اِس وقت کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ مجھے اس مختصر سے عرصے میں تم سے کتنی محبت ہو گئی ہے، اس کا

تمھیں اندازہ نہیں۔'' انور اپنی دُھن میں کہتا ہی چلا گیا۔ اُس کی آواز رُندھ گئی تھی۔

''پھر جب مجھ سے اتنی محبت ہے تو آنے سے کیوں پرہیز کر رہے ہو؟'' شمیم نے شرمندگی سے پوچھا۔

''تم میری مجبوری نہیں سمجھ سکتے شمیم! بہرحال اگر تمھاری یہی خوشی ہے تو میں آجاؤں گا۔''

''لیکن کیا مجبوری ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔ شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''رہنے دو شمیم۔ بس میں آجاؤں گا تم بے فکر رہو!'' انور نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''خیر اگر ایسی ہی کوئی خاص مجبوری ہے تو میں تم کو مجبور نہیں کرتا۔'' شمیم نے چلنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں جو تم سے چھپائی جائے اصل میں میں اپنی بدصورتی کی وجہ سے نہیں آنا چاہ رہا تھا۔ دوسرے میں غریب آدمی تمھیں کوئی ڈھنگ کی چیز بھی تحفے میں نہیں دے سکتا۔'' انور کے لہجے میں پھر اُداسی جھلکنے لگی۔

''تو اس میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے......اوپر کی خوب صورتی اور بدصورتی انسان کے اپنے بس کی بات تھوڑی ہے۔ رہا تحفے کا سوال تو ضروری نہیں کہ تحفہ ضرور ہی دیا جائے۔ بس تم آجانا۔ یہی میرے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے۔'' شمیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

شمیم کی اِس محبت کو دیکھ کر انور کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ مشکل سے بس اتنا کہہ سکا ''ہاں ہاں تم اطمینان رکھو۔ میں ضرور آؤں گا۔''

انور تیرہ سال کا بدصورت سا لڑکا تھا۔ اپنے بے ڈول جسم کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ لگتا تھا۔ اصل میں اُس کا قد عمر کے لحاظ سے کافی لمبا تھا۔ اس پر سینک سلائی سے ہاتھ پیر اُس کو اور بدزیب بنا دیتے تھے۔ رنگ بھی کالا تھا۔ ناک نقشہ بھی بے چارے کا بُرا تھا۔ ہاں اگر اُس میں کوئی چیز پُرکشش تھی تو وہ تھے اُس کے دانت۔ بظاہر اس کے وجود پر سیاہی سی چھائی ہوئی تھی لیکن اُس کی سیرت اُس کے نام ہی کی طرح روشن تھی۔ اس کے کلاس میں کوئی بھی لڑکا اس کی برابر رحم دِل اور ذہین نہ تھا۔ ہر امتحان میں وہ اوّل آتا تھا اور یہی بات اس کے کچھ ساتھیوں کو گراں گزرتی کہ ایک

بدصورت لڑکا اُن سے بازی لے جائے۔ وہ اُس کی بدصورتی کو ڈھال بنا کر اُسے اِتنا چھیڑتے کہ وہ تلملا جاتا اور اپنی بدصورتی پر خوب کڑھتا مگر اُف کرنا اس نے نہ سیکھا تھا۔ یہ دُکھ بھولنے کے لیے وہ اپنی ساری توجہ پڑھائی کی طرف لگا دیتا۔

انور جب دو سال کا بھی نہیں تھا تو باپ کے سایے سے محروم ہو گیا تھا، مگر خوش قسمتی سے باپ نے اتنے پیسے چھوڑ دیے تھے کہ اعلیٰ تعلیم پا سکے۔ وہ پیسے ماں نے اُس کی تعلیم کے لیے بینک میں محفوظ کر دیے تھے اور محنت مزدوری کر کے اپنا اور اس کا پیٹ پال رہی تھی۔

اُس وقت انور ساتویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ کلاس میں ایک اسلم ہی ایسا لڑکا تھا جو اس سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اُس کا مذاق اُڑانے کے بجائے اس کے ساتھ ہنستا بولتا، اس کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتا۔ اصل میں اسلم بھی اپنے دوست انور ہی کی طرح واجبی شکل وصورت کا تھا۔ بس فرق ایسا تھا کہ وہ انور کی طرح بے ڈول نہیں لگتا تھا۔ وہ بھی اپنی بدصورتی کی وجہ سے اپنے حسین ساتھیوں میں جگہ نہ پا سکا تھا اور پھر سب طرف سے مایوس ہو کر وہ انور کی طرف جھک گیا اور جھکتا ہی چلا گیا۔

شمیم کلاس کا سب سے شریر لڑکا تھا۔ وہ اُستاد کی موجودگی میں بھی اُن دونوں پر فقرے چُست کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ ان دونوں کو پاس پاس بیٹھا دیکھ کر وہ چھیڑتا ''اللہ نے مِلائی جوڑی۔ ایک اندھا ایک کوڑھی۔'' اور اکثر اُستاد بھی اس مذاق پر مُسکرا دیتے اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیتے۔ لیکن اب کچھ عرصے سے شمیم میں ایک بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ بات بات پر اُنھیں چھیڑنے والا شمیم اب گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھا ہنسی مذاق کرتا دیکھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اور ساتھی بھی ان میں شریک ہونے لگے۔ اسلم اور انور دونوں حیران تھے۔ اُن کی سمجھ میں اس کایا پلٹ کی وجہ نہیں آ رہی تھی۔ حیرت کے ساتھ ساتھ وہ خوش بھی تھے...... اتنے خوش جیسے انھیں دونوں جہان کی نعمتیں مل گئی ہوں۔

شمیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے بار بار اس کی نظروں میں انور کا اُداس چہرہ گھوم جاتا۔ اُس نے کرنے کو تو یہ مذاق انور سے کر دیا تھا، مگر انور کی اتنی محبت دیکھ کر اس کا دل بھی پسیجنے لگا تھا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے انور اس مذاق کی تاب نہ لائے اور اس خیال کے آتے ہی

ایک شیطانی ارادے نے سر اُبھارا ''اچھا ہے اِس طرح کم بخت کا قصہ پاک ہو۔ اِسی کی وجہ سے تو میں امتحان میں فرسٹ نہیں آتا۔ اُس نے بڑبڑاتے ہوئے قلم اُٹھایا:

ڈیر انور:

احمق اعظم، کبھی آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ میں اور تم سے دوستی کروں! توبہ کرو ایسا لگتا ہے کہ تمھاری صورت کی طرح تمہاری عقل میں بھی بھُس بھرا ہوا ہے۔ پتہ بھی ہے کہ آج کیا تاریخ ہے۔ خیر میں بتائے دیتا ہوں، آج پہلی اپریل ہے۔ مزید بےوقوف بننے سے بہتر یہی ہے کہ یہیں سے رخصت ہو جاؤ۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اتنے دن میں تم کو محض بیوقوف بناتا رہا ہوں۔ یہ دوستی میں نے تم سے محض اس لیے کی تھی کہ اس کی یاد ہمیشہ تمھارے دل میں کانٹا بن کر چبھتی رہے اور تمھاری پڑھائی پر اثر انداز ہو۔ آئندہ مجھ سے کلام کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

شمیم

انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شمیم کے تحفے کے لیے پیسے کہاں سے لائے۔ پانچ روپے تو اس کے پاس تھے بھی جو اُس نے جیب خرچ سے بچا بچا کر جمع کیے تھے۔ مگر وہ شمیم کو اتنا حقیر تحفہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ شمیم ایک بڑے باپ کے بیٹے کی نظر میں پانچ روپے کے تحفے کی کیا وقعت ہوگی؟ یہ بھی اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ماں کے پاس اس وقت کچھ نہ ہوگا اور اس کا بھی اُسے علم تھا کہ ماں بینک سے ایک پائی بھی نہ نکالنے دے گی۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت کر کے ماں سے کہا اور جیسے تیسے ماں کو بینک سے بیس روپے نکلوانے پر راضی کر لیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ ایک عمدہ سا پین خرید لایا اور شمیم کے گھر روانہ ہو گیا۔ سفید سوٹ میں وہ اور بھی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ شمیم کی کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے پین کو ایک بار پھر جیب میں ٹٹولا اور مطمئن ہو کر قدم بڑھایا، مگر چوکیدار نے اگلا قدم اُٹھانے کی اجازت نہیں دی، اور غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک پرچہ بڑھا دیا۔ انور نے حیران ہو کر پرچہ تھام لیا اور اُسے کھول ہی رہا تھا کہ کسی کی چیخ سُن کر وہ چونک پڑا کوئی چیخ چیخ کر کوٹھی میں سے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ انور دوسرے ہی لمحہ تیر کی طرح آواز پر لپکا اور شمیم کو دیکھ کر اس کی بھی چیخ نکل گئی۔ شمیم آگ کے شعلوں میں بری طرح گھرا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک آگ کا شعلہ معلوم ہو رہا تھا اور

بے تحاشہ چیختا ہوا سارے کمرے میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ انور کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ آگ پر کس طرح قابو پائے۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی مگر بے سُود۔ کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جو اُس آگ کو ٹھنڈا کرنے میں مدد دیتی۔ پھر وہ بھاگتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔ آخر اُسے ایک کمرے میں کمبل مل ہی گیا۔ وہ ایک لمحے ضائع کیے بغیر شمیم کے پاس پہنچ گیا اور کمبل اس ڈھنگ سے شمیم پر پھینکا کہ وہ اس کے چاروں طرف پھیل گیا۔ دوسرے لمحے اُس نے شمیم کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور دوسرے کمرے میں لا کر مسہری پر لٹا دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ انور کو خود بھی اپنی پھرتی پر حیرت ہونے لگی۔

آگ اچانک ہوا بند ہو جانے سے بجھ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اُس نے مزید احتیاط کے لیے شمیم کو اچھی طرح چاروں طرف سے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُسے اطمینان ہو گیا تو اُس نے آہستہ سے کمبل ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شمیم بالکل ٹھیک تھا۔ بس سر کے بال جھلس گئے تھے۔

کمبل کے ہٹتے ہی شمیم کی نظر انور پر پڑی اور وہ ایک چیخ مار کر انور سے چمٹ گیا۔ جب انور نے اُسے الگ کیا تو وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ چوکیدار جو اس سارے وقفے میں انور کو بڑی حیرت سے تکتا رہا تھا انور کی آواز سُن کر چونک پڑا جو اُسے ڈاکٹر کے لانے کی ہدایت دے رہا تھا۔ انور شمیم کے سرہانے بیٹھ گیا اور گھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ حیران تھا کہ آخر سالگرہ کے موقع پر گھر کے سب لوگ کہاں چلے گئے، کیونکہ شمیم اور چوکیدار کے علاوہ اُسے اب تک کوئی بھی نظر نہ آیا تھا۔ اچانک اسے پرچے کا خیال آیا اور اس نے جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ مگر بیکار۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور یہ سوچ کر وہ اُٹھا ہی تھا کہ ہوسکتا ہے وہ وہاں گر گیا ہو جہاں شمیم جل رہا تھا کہ شمیم نے کسمسا کر کروٹ بدلی اور دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ انور کو اپنے اتنے قریب پا کر وہ پھر اُس سے چمٹ گیا اور گڑگڑانے لگا "انور، میرے مُحسن، میرے دوست، مجھے معاف کر دو۔ اب میں تمھیں کبھی بدصورت نہیں کہوں گا۔ انور خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔"

انور حیران شمیم کا منہ تک رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر شمیم معافی کس بات کی

مانگ رہا ہے۔ اُس نے پیار سے شمیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا'' آخر کیوں معاف کر دوں؟ کیا برائی کی ہے تم نے میرے ساتھ؟''

''' کیا تمھیں میرا خط نہیں ملا؟'' شمیم نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''خط تو ملا تھا مگر پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔'' انور نے جواب دیا۔

'' کہاں ہے وہ خط؟'' شمیم نے بے چینی سے پوچھا۔

'' وہ تو اِس ہنگامے میں کہیں کھو گیا۔ ٹھہرو میں تلاش کر لاؤں۔ ممکن ہے اس کمرے میں پڑا ہو جہاں تم جلے تھے۔'' انور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

انور خدا کے لیے نہ جاؤ۔ اور اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ اور اگر کہیں مل جائے تو اُسے نہ پڑھنا۔ تمھیں میری قسم۔'' شمیم کی آواز رُندھ گئی۔

''خیر ہٹاؤ۔ یہ بتاؤ تم جل کیسے گئے۔'' انور نے یہ دیکھ کر کہ اِس موضوع سے شمیم کو تکلیف ہو رہی ہے بات کا رُخ بدل دیا۔

''جب میں تمھیں خط لکھ کر اُٹھا تو سر میں شدید قسم کا درد محسوس ہونے لگا۔ گھر میں آج کوئی ہے نہیں۔ ممی ڈیڈی اپنے کسی دوست کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے نوکر بھی آج چھٹی لے کر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اِس لیے میں خود ہی چائے بنانے اُٹھا۔ اسٹو و جلا رہا تھا کہ نہ جانے کس طرح آگ اسپرٹ کے ٹین میں لگ گئی اور نتیجہ میں پیپا پھٹ گیا، اور اس کا سارا اسپرٹ میرے اوپر آ گیا۔ انور اگر اس وقت تم نہ آ گئے ہوتے تو میں دوسری دنیا میں ہوتا۔'' شمیم کی آنکھوں سے ممنونیت کے آنسو بہنے لگے۔

انور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ راہداری میں قدموں کی چاپ سُنائی دی اور وہ اُدھر دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت گھبراہٹ کے عالم میں داخل ہوئے۔ یہ شمیم کے ممی ڈیڈی تھے۔

شام کو جب انور اُس کے پاس سے لوٹنے لگا تو اُس نے وہ پین بھی شمیم کو زبردستی دے دیا۔ شمیم نے لاکھ یقین دلایا کہ اُس کی سالگرہ نہیں تھی۔ انور نے بس اِتنا کہا'' آج کے اِس بھیانک حادثے کے بخیر و خوبی ٹل جانے کی خوشی میں قبول کرو۔'' شمیم پہلے ہی اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ اِس محبت پر اس کے آنسو نکل پڑے۔

پھاٹک سے گزرتے وقت انور کو شام کی سرسراتی ہوا میں وہی پرچہ پھڑ پھڑاتا نظر آیا۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ دیکھے کیا لکھا ہے، مگر پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر وہ اُس کے اوپر پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جولائی 1968)

●●●

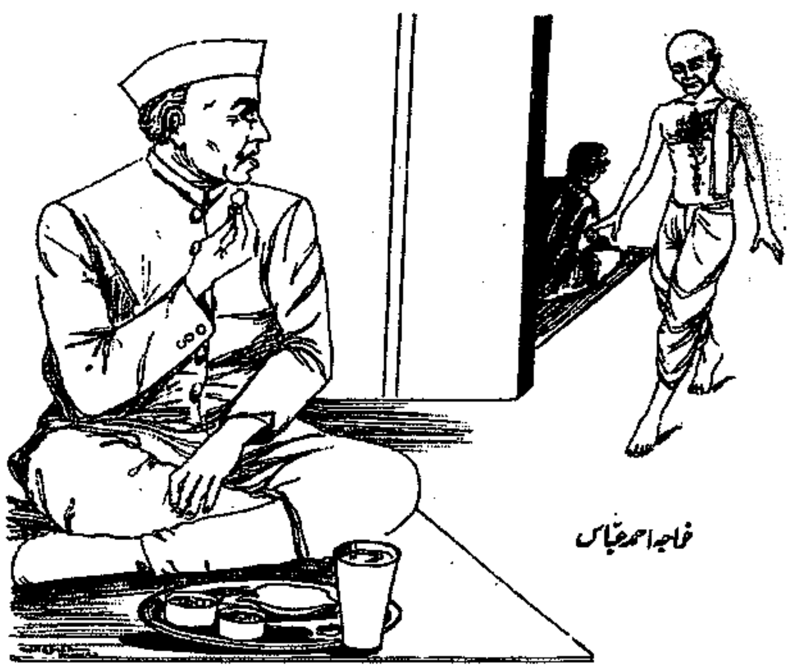

سوزی فنڈ

انور اشفاق

پیاری سہیلیو!

آج اسٹوڈنٹس یونین کا ہنگامی جلسہ ایک اہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے منعقد ہوا ہے۔ میں اس مسئلے کو آپ سب کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ سب مسئلے کو حل کرنے میں مدد دے کر رحم دل اور ہمدرد ہونے کا ثبوت دیں گی۔

آپ سب سوزی کو تو جانتی ہیں۔ اسکول کی کون سی ایسی لڑکی ہے جسے اس سے محبت نہ ہو...... جو پیار نہ کرتی ہو...... کون سی لڑکی ہے جس نے اس کو چاکلیٹ نہ کھلایا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اسکول کی ہر لڑکی نہ صرف اس کا خیال رکھتی ہے بلکہ اس کو دل و جان سے چاہتی ہے۔'' ''کیا یہ غلط ہے؟۔ جواب دیجیے۔''

اسٹوڈنٹس یونین کی صدر نغمہ نے تقریر کے دوران لڑکیوں سے سوال کیا۔

''جی نہیں!۔ جی نہیں! آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ صحیح کہا ہے۔ سوزی سے ہم سب پیار کرتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں سوزی کا شور مچا۔

شور ختم ہوا۔ نغمہ نے پھر تقریر شروع کی۔

''ہاں تو سوزی سے آپ پیار کرتی ہیں۔ محبت کرتی ہیں۔ اس لیے اگر اس پر کوئی بُرا وقت آئے۔ وہ تکلیف میں ہو تو ہمیں اس کی مدد بھی کرنا چاہیے۔''

اسٹوڈنٹس کی سکریٹری جبیں قاف نے کل سوزی کے متعلق جو خبر سنائی تھی اُس کو سن کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ آپ سب کو بھی جب معلوم ہوگا تو آپ کو بھی دُکھ ہوگا۔ اسکول کینٹین کی مالکہ رخسانہ دیوی نے معمولی سی بات پر سوزی کو نہ صرف پیٹا بلکہ اس کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا۔ ممکن ہے کہ سوزی کی غلطی ہو لیکن رخسانہ دیوی کو بے دردی سے نہ مارنا چاہیے تھا۔ کل سے سوزی اسکول میں نہیں ہے۔ ہم سب کو تنہائی کا احساس ہو رہا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی قیمتی چیز کھو دی ہے۔ ہمارا کوئی عزیز ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ سوزی سب کی پیاری ہے۔ اس لیے اس کو دوبارہ اسکول میں لانا چاہیے۔ اس کی مدد کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس سلسلہ میں اسٹوڈنٹس کی اراکین نجمہ، سلمٰی، رکمنی، جولی، میری، خیرالنساء، مہرالنساء، ناہید، فیروزہ، کوثر اور صفیہ نے چند تجاویز پیش کی ہیں جو میں آپ سب کے سامنے پیش کرتی ہوں۔''

1۔ اسکول کینٹین کی مالکہ رخسانہ دیوی کے بے رحمانہ سلوک کی بنا پر کینٹین کا ''بائیکاٹ'' کرنا چاہیے۔ کل سے کوئی بھی لڑکی کینٹین سے کوئی چیز نہیں خریدے گی۔

2۔ اس واقعہ کی ایک تفصیل ایک یادداشت کی صورت میں پرنسپل صاحبہ کو دی جائے تا کہ وہ بھی ہماری تجویز کی مخالفت نہ کریں۔

3۔ سوزی کی ہر طرح سے مدد کرنا چاہیے۔ جس کے لیے سوزی فنڈ قائم کیا جائے۔

نغمہ نے تجاویز سنا کر تقریر ختم کرنے کا اعلان کیا۔ صدر کی تقریر تالیوں کی گونج میں ختم ہوئی۔

ابھی سب نے صدر صاحبہ کی تقریر سنی۔ انھوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں اگر اس پر کوئی بہن تبصرہ کرنا چاہے تو بڑے شوق سے کر سکتی ہیں۔ سکریٹری جبیں نے کہا۔

''ہم سب کو تجاویز پسند ہیں۔ ہم سب سوزی کی مدد کو تیار ہیں۔ لڑکیوں کا شور بلند ہوا......اور لڑکیوں نے چندہ دینا بھی شروع کر دیا۔

دیکھتے دیکھتے ''سوزی فنڈ میں پچاس روپے کے قریب جمع ہو گئے۔ جلسہ ختم ہونے سے پہلے سکریٹری نے کہا'' آج کی طرح کل بھی شام کو اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد اسی کھیل کے میدان میں جلسہ ہوگا......ہم سوزی کو بھی کل کے جلسے میں لانے کی پوری کوشش کریں گے۔''

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ کو اسٹوڈنٹس یونین کے ہنگامی جلسے کی اطلاع ملی۔ وہ چونک پڑیں

کہ آخر جلسہ کیوں ہوا۔ پرنسپل نے ایک ماہ پہلے واڈیا اسکول کا چارج لیا تھا۔ انھوں نے ایک ماہ کے اندر اسکول کی ترقی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اس لیے انھیں فکر ہوئی۔ انھوں نے فوراً صدر اور سکریٹری کو کلاس سے بلوایا۔ انھوں نے تفصیل سنا کر عرضی دی اور شام کو جلسے میں آنے کی دعوت بھی دی۔ پرنسپل صاحبہ نے مسکراتے ہوئے شام کو جلسے میں شرکت کرنے کا وعدہ کیا اور واقعے کی چھان بین کرنے کا بھی پکا وعدہ کیا۔

حسبِ اعلان اسٹوڈنٹس یونین کا جلسہ منعقد ہوا۔ اسٹوڈنٹس یونین کی صدر نغمہ اور سکریٹری جبین نے تقریر کی۔ تقریر میں دونوں نے بتایا کہ کس کس طریقے سے سوزی کی مدد کی گئی۔ اور سوزی کو مصیبت سے نکال کر کیوں کرلایا گیا۔

جلسے میں پرنسپل صاحبہ نے بھی تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے تقریر شروع کی۔

"آج اسٹوڈنٹس یونین کے جلسے میں شرکت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بے پناہ خوشی تو یہ دیکھ کر ہوئی کہ ہمارے اسکول کی لڑکیاں ذہین، تیز، رحم دل اور ہمدرد ہونے کے علاوہ ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق ہے۔ اتحاد و اتفاق ایک ایسی طاقت ہے جو ملک و قوم کو ترقی دے سکتی ہے۔ اگر تم سب میں اسی طرح اتحاد و اتفاق رہا تو تمھارا مستقبل شاندار ہوگا۔ ترقی اور کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔"

مجھے "سوزی کا واقعہ" معلوم ہوا۔ مجھے بھی دُکھ ہوا۔ میں نے فوراً کینٹین کی مالکہ کو بلوایا۔ میں نے ان کے بے رحمانہ سلوک کی مذمت کی تو انھوں نے خود بھی کہا کہ غصّے کی بنا پر انھوں نے غلطی کی۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہے اور اپنے رویّے پر افسوس بھی ہے۔ وہ جب شرمندہ ہیں تو انھیں اور زیادہ شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان کی طرف سے تم سب سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ وہ خود سوزی کا خیال رکھیں گی، اور ان سے اب کسی کو بھی شکایت نہ ہوگی۔ اس لیے اب تم سب کینٹین کا "بائیکاٹ" کرنے والی تجویز کو واپس لے لو اور کینٹین کو اپنی کینٹین سمجھ کر چیزیں خریدو۔

اب سوزی اسکول آگئی ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ اُسے بھول جاؤ۔ سوزی سے جس طرح تم سب کو محبت ہے اسی طرح مجھے اور رخسانہ دیوی کو بھی محبت ہے۔ جلسے میں سوزی کو دیکھ کر مجھے تم سب

کی ہمدردی اور رحم دلی دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ تم سب نے "سوزی فنڈ" قائم کر کے چندہ جمع کیا۔ سوزی کو تم میونسپل ڈیپارٹمنٹ سے لے آئی ہو اس کو وہاں سے لانے میں دقت ہوئی ہوگی۔ اگر تم سب پہلے ہی سے سوزی کی فیس بھر کر لائسنس حاصل کر لیتیں تو کوئی بھی "ڈاگ ڈیپارٹمنٹ" میں فون کر کے سوزی کو آوارہ بتا کر نہیں پکڑوا سکتا تھا۔ اب تم "میونسپل ڈاگ ڈیپارٹمنٹ" سے سوزی کو لے آئی ہو۔ تم نے اس کے گلے کے پٹے پر لائسنس نمبر بھی لگوا دیا ہے......اب سوزی کو کوئی بھی نہ پکڑ سکے گا۔

میں تم سب کی رحم دلی اور ہمدردی کے کارنامے پر تم سب کو مبارک باد دیتی ہوں۔ آئندہ بھی تم نہ صرف انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی سے پیش آؤ بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی اسی ہمدردی اور رحم دلی کا برتاؤ کرو۔

پرنسپل صاحبہ کی تقریر ختم ہوئی۔ سوزی دم ہلاتی ہوئی کسی کے ہاتھ کسی کے پیر کو چاٹتی ہوئی اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ رخسانہ دیوی نے اُسے گود میں اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ گود میں نہ آئی اُچھل کر کود گئی۔ سکریٹری جبیں قاف نے سوزی کو گود میں اٹھا لیا تو پرنسپل صاحبہ نے اپنا ہار اتار کر سوزی کے گلے میں ڈال دیا۔

رخسانہ دیوی نے نعرہ لگایا...... پیاری سوزی زندہ باد۔

شیلا پاٹھے نے نعرہ لگایا......واڈیا اسکول کی سوزی زندہ باد۔

خیر النساء اور مہر النساء چلائیں......ہم سب کی پیاری سوزی زندہ باد۔

سلمہ، زہرہ، ناہید، عذرا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا ہم سب سوزی سے محبت کرتے ہیں۔ سوزی زندہ باد...... سوزی زندہ باد......سوزی کتیا زندہ باد......سوزی کتیا زندہ باد جلسہ میں بھی شور ہوا اور جلسہ ختم ہو گیا۔

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، اگست 1964)

●●●

ٹیگور

قیصر سرمست

بنگال کے ایک امیر گھرانے کے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ان کا ایک بہت ہی چہیتا بیٹا تھا۔ باپ کا نام دیبندر ناتھ تھا اور بیٹے کا نام رابندر ناتھ۔ یہ خاندان ''ٹیگور خاندان'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ دیبندر ناتھ ٹیگور مذہبی آدمی تھے اور وہ پرسکون جگہ کی تلاش میں تھے جہاں وہ اطمینان اور سکون کے ساتھ خدا کی یاد میں منہمک رہ سکیں۔ جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے۔ انھیں ایک ایسی جگہ مل ہی گئی۔ دیبندر ناتھ ٹیگور کا گزر ایک ایسے علاقہ سے ہوا جہاں حدِ نظر تک کھلے میدان اور کھیت تھے۔ انھیں یہ جگہ بہت پسند آئی۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ یہاں دیبندر ناتھ جی کو خدا کا جلوہ نظر آیا تھا۔ یہ روایت سچ ہو یا نہ ہو مگر یہ حقیقت تھی کہ اس جگہ خاموشی برستی تھی۔ دیبندر ناتھ اس مقام کی خاموشی اور وہاں کے پُرسکون ماحول سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چند ایکڑ زمین انھوں نے خرید ڈالی اور اس کا نام ''شانتی نکیتن'' رکھا۔

یہ جگہ جہاں شانتی نکیتن واقع ہے، مغربی بنگال کے ضلع پربھوم میں ہے اور بول پور اس کا قریب ترین ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن اور شانتی نکیتن کے درمیان ڈیڑھ میل کا مختصر سا فاصلہ ہے۔ اگر شانتی نکیتن کا رقبہ دیکھا جائے تو ایک میل سے بھی کم ہے لیکن اِس ایک میل کے رقبہ میں جو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے، وہ دنیا کے کسی اور حصہ میں شاید ہی ملتا ہوگا، یہاں کی یونیورسٹی اپنے انوکھے طریقۂ تعلیم کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

اس یونیورسٹی کی طالبات اور طلبا کو پکنک اور سیر وتفریح کی بہت سی سہولتیں قدرتی طور پر مہیّا ہیں۔ یہاں سے ایک میل دور دریائے کوپائی ایک تنگ، شفاف چشمے کی صورت میں برس کے بارہ مہینے بہتا رہتا ہے۔ شانتی نکیتن کے شمال مشرق میں ایک مقام پرول ہے جو بہترین تفریح گاہ ہے۔ یہاں طلبا اور طالبات پکنک کے لیے اکثر جاتے ہیں۔

شانتی نکیتن ایسی پُرسکون جگہ ہے جہاں آدمی دنیا سے اپنا تعلق توڑ کر خدا سے ناتا جوڑ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان کو دلی سکون نصیب ہوتا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ سچے اور خدا رسیدہ آدمی کو ایسی ہی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیبند رناتھ نے درختوں کے جھنڈ کے مشرق میں ایک، دومنزلہ عمارت تعمیر کرائی۔ یہی شانتی نکیتن کی قدیم ترین عمارت ہے جسے اب مہمان خانہ بنادیا گیا ہے۔

7 مئی 1861 کا دن ٹیگور خاندان کے لیے بڑا مبارک اور یادگار دن تھا، کیونکہ اسی دن اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہی معصوم سا لڑکا آگے چل کر اپنی شاعری کی بنا پر مہا کوی کہلایا اور نوبل پرائز حاصل کیا۔ اس لڑکے کا نام تھا رابندر ناتھ ٹیگور۔

1913 میں یعنی باون سال کی عمر میں رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کی مشہور ترین کتاب ''گیتانجلی'' پر نوبل پرائز دیا گیا۔ یہی رابندر ناتھ ٹیگور، جنھیں نوبل پرائز ملا، بچپن میں پڑھائی سے بہت جی چراتے تھے، اس لیے کہ انھیں پڑھائی کے اس طریقے سے سخت نفرت تھی جو اس زمانے میں اسکولوں میں رائج تھا اور اب بھی ہے، یوں تو وہ اپنے پتا کے ساتھ اکثر شانتی نکیتن جایا کرتے تھے، مگر زیادہ وقت آشرم سے قریب بہنے والے چشمے پر پتھر جمع کرنے میں اور کھیلنے میں گزر جاتا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور انگریزی طریقۂ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی۔ وہ فطری طور پر بچوں کو تعلیم دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ خود ابھی یہ سمجھ نہ سکے تھے کہ وہ طریقۂ تعلیم کیسا ہونا چاہیے۔ انگریزی طرزِ تعلیم سے نفرت کی وجہ سے ٹیگور نے ایک نیا نظام تعلیم رائج کیا جو شانتی نکیتن کی صورت میں آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔ ٹیگور نے شانتی نکیتن کی بنیاد 1901 میں رکھی تھی اور اس کے اکیس سال بعد یعنی 1921 میں وشوا بھارتی وشوا ودیالیہ قائم کیا۔

اپنی ایک تقریر میں ٹیگور نے اپنی نا تجربے کاری اور تعلیم کے نئے نظام سے ناواقفیت کا کھلے

طور پر اعتراف کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں: ''جب میں نے اسکول کی بنیاد رکھی تو اس وقت حقیقت میں نہ تو مجھے تعلیم دینے کا تجربہ تھا اور نہ کوئی طریقۂ تعلیم مجھے معلوم تھا۔ اس کے باوجود میں اسکول اس بھروسہ پر چلاتا رہا کہ میں بچے کی فطرت کو سمجھ سکوں گا۔''

رابندر ناتھ ٹیگور کی اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم کا بے جا بار بچوں کے ذہنوں پر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ پہلے وہ بچے کی فطرت کو سمجھنے کے خواہش مند تھے۔ وہ بچوں کو مشینی طور پر رٹائے جانے والے سبق، جبر اور سختی کے انتہائی مخالف تھے اور جو برتاؤ اس دور میں بچوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا اس سے ٹیگور کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ ٹیگور کا کہنا تھا کہ ان ہی وجہوں سے بچے رٹائے ہوئے سبق بھول جاتے ہیں۔ اپنی تقریر میں ٹیگور اس طرح اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔

''میں نے یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ بچوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں سختی سے یہ محسوس کیا کہ طرزِ تعلیم انسان کی زندگی سے واقعی علاحدہ ہے...... اسکول میں گرامر بھی سیکھی اور حساب بھی اور بہت سی چیزیں بھی۔ لیکن اب میں سب بھول چکا ہوں۔''

بھولنے کی وجہ ہے ہمارا موجودہ ناقص طریقۂ تعلیم۔ بچوں کے رجحان اور میلان کا خیال کیے بغیر بچے کو مقررہ کورس پڑھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ وہ بے بس ہو کر کسی طرح رٹ رٹا کر کامیاب تو ہو جاتا ہے، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد وہ سب کچھ بھول جاتا ہے جو اسے پچھلی جماعتوں میں بتایا گیا تھا۔

ٹیگور دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ حساس واقع ہوئے تھے اور اسی احساس کی بنا پر وہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نہ صرف مخالف تھے بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ اگر وہ بھی عام بچوں کی سمجھ بوجھ لے کر پیدا ہوتے تو یقیناً وہ بھی موجودہ غلط نظامِ تعلیم کو اپنا لیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ یہ ان ہی کی زبانی سنو! ''...... مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں میرے اندر زیادہ احساس تھا۔ اگر یہ احساس نہ ہوتا تو میں اس تعلیم سے مطمئن ہو جاتا۔''

اب ذرا استاد کے پڑھانے کے انداز، جماعت کے متعلق بچوں کی ذہنیت اور کورس کی صورت میں ہر صبح دہرائے جانے والے گانے کے متعلق ٹیگور کے تاثرات سنو! وہ کہتے ہیں۔

''مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب کلاس روم کا دروازہ مجھے ایک بڑے مندر کی طرح دکھائی دیتا تھا جس میں لکڑی کی بنچیں رکھی ہوئی تھیں اور ٹیچر ایک زندہ گراموفون کی طرح سبق پڑھاتا ہوتا۔

مجھے اب بھی وہ گانا یاد ہے جس میں کوئی حسن اور دل فریبی نہیں تھی، جسے ہم صبح کلاس میں داخل ہونے سے پہلے کورس کی صورت میں دُہرایا کرتے تھے۔"

ٹیگور فطری اور قدرتی ماحول کے بڑے دلدادہ تھے، اس زمانے میں ٹیگور کے خیالات کی تائید کرنا تو دُور کی بات ہے ان پر کوئی اعتماد بھی نہیں کرتا تھا، کیونکہ ان کے پاس کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں تھی۔ وہ کتنے ہی بڑے شاعر، ناول نگار، بلند مرتبہ افسانہ نویس، ماہر مصوّر، شفیق معلّم اور عمدہ مقرر کیوں نہ ہوں، مگر ہم جیسے عقل کے اندھوں کو کاغذ کا وہ معمولی سا ٹکڑا بھی چاہیے جو اس بات کی تصدیق کردے کہ وہ قابل ہیں۔ یہ بڑی بُری بات ہے کہ انسان کی قابلیت کا اندازہ اس کی ذاتی علمیت سے نہیں لگایا جاتا بلکہ ڈگری دیکھی جاتی ہے۔ ٹیگور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک جگہ ٹیگور اس بات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔...... "سچ بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص مجھ پر اس معاملے میں اعتماد نہیں رکھتا تھا نہ میرے پاس کوئی یونیورسٹی کی ڈگری ہے نہ تعلیمی امتیاز۔ میں ایسا شخص تھا جو شعر لکھنے کے کوسوا کچھ نہ جانتا تھا۔"

ٹیگور کی رائے میں تعلیم کی اصل اہمیت کچھ اور تھی۔ وہ آپس کے اتفاق اور اتحاد کو اہم سمجھتے تھے۔ ٹیگور یہ نہیں چاہتے تھے کہ ننھے دماغوں پر تعلیم کا بوجھ لادا جائے بلکہ وہ بچوں کو قدرتی حُسن اور دل فریبی سے روشناس کرانا چاہتے تھے، وہ کہتے ہیں:

"تعلیم سب سے اہم نہیں ہے...... سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی کوشش کریں۔ میرے نزدیک ایک بچہ بارہ سال کی عمر تک پوری طرح شعوری نہیں بلکہ بے شعوری زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لیے ان برسوں میں علم کا بوجھ ان کے دماغوں پر نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ ان کا دماغ قدرتی خوبصورتی کا شیدائی بن جائے۔"

ٹیگور نے اپنے اس خوب صورت اور انوکھے خیال کو عملی طور پر شانتی نکیتن کی صورت میں ظاہر کر دیا۔ شانتی نکیتن قائم ہونے کے بعد ان کی بے چین روح کو کچھ شانتی ملی اور انھوں نے جی جان سے اس کو پروان چڑھایا اور ترقی دینے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ شروع میں ان کے سپرد صرف پانچ بچے کیے گئے تھے...... ٹیگور نے چالیس سال کی عمر میں اس اسکول کی بنیاد ڈالی، جہاں ان کے پتا آنجہانی دیبندر ناتھ نے آشرم تعمیر کرایا تھا۔ یہ اسکول سے ترقی کر کے کالج بنا کالج سے ترقی

کر کے یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

شانتی نکیتن میں تعلیم کا بڑا ہی انوکھا طریقہ رائج ہے...... بچوں پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جاتی اور ان کے دماغوں پر غیر ضروری بار نہیں ڈالا جاتا۔ انھیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ امتحانات جہاں چاہیں دے سکتے ہیں۔ یعنی یونیورسٹی کے احاطے میں کہیں بھی دے سکتے ہیں۔ امتحانات کے دوران ان پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کوئی نگراں مقرر نہیں کیا جاتا۔ انھیں شروع ہی سے اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ خود پر اور دوسروں پر اعتماد کریں۔ بچوں کے بارے میں ٹیگور کا خیال انتہائی بلند اور پاک تھا۔ وہ کہتے ہیں:

'ہر بچہ خدا کا یہ پیغام لے کر اس دنیا میں آتا ہے کہ میں ابھی انسان سے ناامید نہیں ہوا۔'' اس لیے شانتی نکیتن کے طلبا و طالبات کو تفریحی اور تعلیمی ہر طرح کی آزادی حاصل ہے لڑکے میدانوں میں اپنے جلسے اور پکنک کرتے ہیں۔ ان کی تفریحات کھلی فضا میں ہوتی ہیں۔ ناچ گانے، مصوری وغیرہ کی یہاں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے...... چاندنی راتوں میں سب لڑکے اور لڑکیاں مل کر گاتے ہیں، اور دلچسپ، سبق آموز اور معلوماتی قصّوں کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں۔

اس یونیورسٹی میں دور دور سے علم وفن کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ یہاں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ ٹیگور نے انگریزی طریقۂ تعلیم سے بغاوت کر کے ایک نئے نظام کو روشناس کرایا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بندھے ٹکے اصولوں پر چلنا ضروری نہیں۔ شانتی نکیتن کے بچوں میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ عام بچوں سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ ٹیگور کی دلی تمنا تھی کہ بچوں کے چہرے ہمیشہ مسرّت سے دمکتے رہیں، پھول کی طرح تر وتازہ دکھائی دیں۔ یہی خصوصیت یہاں کے ہر بچے میں ملے گی۔ اگر یہی بات ہم دوسرے کالجوں کے بچوں میں دیکھنا چاہیں گے تو ہمیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ شانتی نکیتن کے بچے تعلیم، ادب اور فنونِ لطیفہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

مہا کوی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا حسین تعلیمی خواب آج اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ دنیا کے سامنے موجود ہے اور اپنی بڑائی منوا رہا ہے۔

●●●

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، ستمبر 1966)

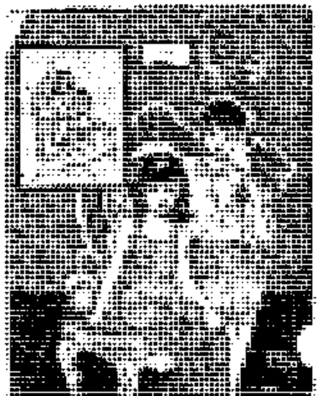

خزانے کی تلاش

انجم پرویز

افریقہ کے اس بھیانک جنگل میں مارے مارے پھرتے ہوئے اُنھیں ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ کرنل جانسن بے حد اُداس تھا۔ اُسے اپنے بنائے ہوئے منصوبے ڈوبتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا حبشی نوکر عبداللہ خیمے سے باہر خچروں کی مالش کر رہا تھا۔ جیک فرش پر لیٹا سگار پھونک رہا تھا۔ کرنل کے چہرے پر بے چینی، مایوسی اور غصّے کے ملے جُلے جذبے دکھائی دے رہے تھے..... وہ خیمے میں ایک طرف سے دوسری طرف بے چینی سے چکّر لگا رہا تھا۔

جولیا سے اپنے باپ کا پریشان اور اُداسی میں ڈوبا چہرہ نہ دیکھا گیا۔ آخر اُس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا: ''ڈیڈی! یہ خزانہ وغیرہ کا چکّر سب واہیات خیالی باتیں ہیں، لیکن آپ پر تو بس خزانہ کی دھُن سوار ہے۔''

جولیا کے ہم خیال جیک نے منہ اوپر اُٹھا کر دیکھا کہ شاید کرنل پر اپنی بیٹی کی بات کا اثر ہوا ہو، اور وہ اپنا خیال بدل ڈالے..... لیکن کرنل کا جواب یہ تھا: ''چپ رہ نادان لڑکی! یہ خزانہ اسی جنگل میں کہیں نہ کہیں موجود ہے، میں جنگل کا چپّہ چپّہ چھان ماروں گا اور خزانہ حاصل کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ آہ! خزانہ جس کے لیے میرے دوست نے جان دے دی۔

جیک نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔

اور یہ حقیقت تھی کہ اسی خزانے کے چکر میں کرنل جانسن کے جگری دوست کرنل جان ٹمبرنگ

افریقہ کے اس بھیانک جنگل کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

کرنل جانسن اور کرنل جان ٹمبرنگ دونوں کا طالب علمی کا زمانہ ایک ساتھ گزرا تھا۔ دونوں ایک ساتھ فوجی زندگی میں داخل ہوئے تھے اور ایک ہی ساتھ ریٹائر بھی ہوئے تھے۔ ایک دن کرنل جان ٹمبرنگ بغیر کسی کو کچھ بتائے غائب ہو گئے۔ انھیں بہت تلاش کیا گیا، لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

کرنل جانسن کے پاس عبداللہ نامی ایک افریقی ان کا ایک خط لے کر آیا۔ خط میں لکھا تھا:

پیارے دوست!

میرے اچانک غائب ہو جانے پر تم ضرور حیران ہوگے۔ لیکن یہ خط پڑھ کر تمھاری ساری حیرانی دُور ہو جائے گی۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ میں کیسا مہم پسند فطرت کا آدمی ہوں۔ ہاں تو مجھے ایک کتاب میں ایک قدیم افریقی خزانے کا نقشہ ملا۔ یہ خزانہ تاریک برّ اعظم افریقہ کے جنگلوں میں ہی کہیں دفن ہے۔ میں کسی کو کچھ بتائے بغیر خزانہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، کیونکہ مجھے معلوم تھا خزانے کی بات سُن کر کوئی یقین نہ کرے گا اور سب میرا مذاق اُڑائیں گے۔ میں نے خزانے کی بہت تلاش کی لیکن افسوس اُسے پانے میں ناکام رہا۔ میری ٹانگیں سوج کر کُپّا ہو گئی ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک پیلے رنگ کا زہریلا مچھر ہوتا ہے اُن مچھروں نے کاٹ کاٹ کر میرا جسم مفلوج کر دیا ہے۔ میں اس بھیانک جنگل میں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ نہ جانے آنے والا کون سا لمحہ میرے لیے موت کا پیغام لائے۔ ایک افریقی کے ہاتھوں یہ خط اور خزانے کا نقشہ بھیج رہا ہوں...... یہ سوچ کر کہ میں تو اس مقصد میں ناکام رہا شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔

تمھارا دوست:

جان ٹمبرنگ

یہ خط پڑھتے ہی کرنل جانسن پر جنون سا سوار ہو گیا۔ وہ دوسرے ہی دن اپنے ایک مہم پسند نوجوان دوست جیک کے ہمراہ اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ ساتھ میں ان کی لڑکی جولیا اور افریقی عبداللہ بھی تھے۔ انھوں نے کرنل جان ٹمبرنگ کو بہت تلاش کیا لیکن ناکام رہے۔ آخر وہ اس کی طرف سے مایوس ہو گئے۔

ڈیڈی آپ نے کہا تھا کہ نقشے میں ایک سُرخ چٹان کو تلاش کرنے کے لیے لکھا ہے۔ وہ دیکھیے

سامنے ایک چٹان نظر آ رہی ہے۔" جولیا نے چیختے ہوئے کہا۔

جولیا کی آواز پر سب لوگ اس چٹان کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن یہ دیکھ کر سب مایوس ہو گئے کہ چٹان، عام چٹانوں کی طرح سیاہ پتھر کی تھی، سُرخ نہ تھی۔ کرنل نے مایوسی سے چٹان کو ایک مکا مارا اور کہا "ایک چٹان نظر آئی وہ بھی سیاہ۔" لیکن چٹان پر ان کے مکا مارنے پر ایک عجیب بات ہوئی۔ چٹان کو ہاتھ لگتے ہی ڈھیر ساری مٹی جھر جھر کی آواز کر کے زمین پر گر گئی اور اندر سے سُرخ پتھر جھلکنے لگا۔ اب انھوں نے سمجھا کہ صدیوں سے ایک جگہ رہنے پر چٹان پر مٹی اور دھول جم گئی تھی اور وہ سیاہ رنگ کی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے نقشہ میں دیکھا تو لکھا تھا: "چٹان میں ایک جگہ سُرخ پتھر لگا ہوا ہے جسے سرکانے پر ایک دروازہ نمودار ہوگا اور پھر اس کے اندر خزانہ کا کمرہ ہوگا۔"

سب لوگ چٹان کے ایک ایک گوشے کو ٹٹول کر وہ خاص پتھر تلاش کرنے لگے۔ کافی دیر بعد جولیا نے ایک پتھر کو کھسکایا۔ وہ کافی تھک گئی تھی، اس لیے اس نے اپنا سارا زور پتھر پر صرف کر دیا...... پتھر کے ہٹتے ہی ایک خلا نمودار ہوا اور جولیا خلا میں غائب ہوگئی۔

سب لوگ اُس خلا کی طرف بھاگے، لیکن جیسے ہی انھوں نے اندر داخل ہونا چاہا انھیں بدبو کا احساس ہوا۔ یہ کمرے کے اندر کی گندی ہوا تھی جو پتہ نہیں کتنے برس سے کمرے میں بند تھی۔ چند منٹ بعد جب باہر کی تازہ ہوا کمرے میں داخل ہونے لگی تو وہ سب اندر داخل ہوئے۔ اندر فرش پر جولیا بیہوش پڑی تھی۔ انھوں نے جولیا کو تازہ ہوا میں باہر لٹا دیا۔ اب انھوں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کمرے کے ایک کونے میں ایک بڑا صندوق رکھا ہوا نظر آیا انھوں نے صندوق کھولا تو حیرت اور خوشی کے مارے اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صندوق لبالب سونے کی سلاخوں اور ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ اندر ایک کاغذ پر افریقی زبان کی ایک تحریر بھی انھیں ملی جس سے پتہ چلا کہ یہ خزانہ کسی اسمگلر کا تھا جو پولیس کے تعاقب سے بچ کر اِس جنگل میں نکل آیا اور اپنا خزانہ اس جگہ چھپا کر نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا۔

انھوں نے جلدی جلدی خزانے کو خچروں پر لادا، جولیا بھی ہوش میں آ چکی تھی وہ بھی خزانے کو دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئی۔

کاش میرا دوست مجھے مل جاتا اور یہ خزانہ دیکھتا۔" کرنل نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

قافلہ واپس روانہ ہوگیا۔

''یہ تو وہی جنگل کا علاقہ معلوم ہوتا ہے جہاں میں نے جان ٹمبرنگ صاحب کو دیکھا تھا اور جہاں انھوں نے مجھے وہ خط اور نقشہ دیا تھا۔'' افریقی عبداللہ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو انھیں یہاں تلاش کرنا چاہیے۔'' جیک نے کہا۔ لیکن انھیں جان کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھوں نے ایک کمزور آواز سُنی۔ انھیں کچھ دور فاصلے پر کوئی شخص نظر آیا۔ کرنل جانسن فوراً اس سمت بھاگے اور جا کر فوراً اُس شخص سے لپٹ گئے۔

''پیارے جان! تم اس حالت میں! آہ'' ان کی زبان سے بے اختیار نکلا..... کرنل جان ٹمبرنگ نیم غشی کی حالت میں ایک دلدل کے کنارے پڑے تھے۔ کیڑے مکوڑوں، مچھروں نے انھیں کاٹ کاٹ کر اُدھ مرا کر رکھا تھا۔ ان کا جسم سُوج کر چار گُنا ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی پڑی تھیں۔ جلدی جلدی ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ اور جب کرنل جانسن نے انھیں خزانہ ملنے کی بات بتائی تو ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔

''میرا اصلی خزانہ تو یہ ہے۔'' یہ کہہ کر کرنل نے بے اختیار جان کو گلے سے لگالیا۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، اگست 1968)

●●●

تین بہنیں

ایس، ایم، حیات بادشاہ

بہت دن ہوئے عرب میں ایک سلطان حکومت کرتا تھا۔ اپنی رعایا کا حال جاننے کے لیے وہ ہر رات کو اپنے وزیر کے ساتھ شہر میں گشت لگاتا تھا۔ ایک دن گشت لگاتے ہوئے وہ ایک محلّے سے گزرا۔ ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے اندر سے کچھ لڑکیوں کے بات چیت کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سلطان نے غور سے اُن کی باتیں سُنیں۔

پہلی لڑکی نے کہا، ''میں چاہتی ہوں میری شادی سلطان کے ڈبل روٹی بنانے والے سے ہو جائے۔ وہ مجھے جی بھر کر ڈبل روٹیاں کھلائے گا۔''

دوسری نے کہا ''میں چاہتی ہوں میری شادی سلطان کے کھانا بنانے والے سے ہو جائے۔ وہ مجھے خوب مزے دار کھانے کھلائے گا۔''

تیسری نے کہا ''عجیب خواہشیں ہیں تمھاری میں تو چاہتی ہوں کہ میری شادی سلطان ہی سے ہو جائے۔ میں ملکہ بن کر سارے ملک پر راج کروں گی اور ساری دنیا کا سُکھ چین میرے لیے ہوگا!''

دوسرے دن سلطان نے تینوں لڑکیوں کو محل میں طلب کیا۔ پہلی اور دوسری لڑکی کی شادی اس نے اُن کی خواہش کے مطابق ڈبل روٹی بنانے والے سے اور کھانا بنانے والے سے کرا دی اور تیسری لڑکی کو شاہی اعزاز کے ساتھ اپنی ملکہ بنالیا۔

تینوں بہنیں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ چند دن کے بعد چھوٹی بہن کو بے حد سکھی دیکھ کر دوسری دو بہنوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اپنی چھوٹی بہن کو سلطان کی نظروں سے گرانے کے لیے دونوں بہنوں نے کئی منصوبے باندھے۔ ہردم وہ موقع کی تاک میں رہنے لگیں۔

شادی کے دوسرے برس چھوٹی بہن کے بیٹا پیدا ہوا۔ دونوں بہنوں نے بچے کو فوراً ٹوکری میں بند کر کے محل کے باہر ندی میں ڈال دیا اور بچے کی جگہ ایک کتے کا مرا ہوا پلاّ لا کر سب کو دکھانے لگیں اور کہنے لگیں کہ ملکہ کے کتے کا یہ مرا ہوا پلاّ پیدا ہوا ہے! سلطان کو ملکہ پر بے حد غصہ آیا۔ اس نے وزیر کو حکم دیا کہ ملکہ کی گردن ماردی جائے۔ لیکن وزیر کی التجا پر ملکہ کی جان بخش دی گئی۔ اسی طرح جب ملکہ کے دوسرا بچہ پیدا ہوا تو بھی دونوں بہنوں نے اس بچے کو ٹوکری میں بند کر کے ندی میں بہا دیا اور سب کے سامنے بلّی کا بچہ پیش کر دیا کہ ملکہ کے یہی ہوا ہے۔ اس بار بھی سلطان کو ملکہ پر بے حد غصہ آیا اور اس نے اُسے قتل کر دینے کا حکم دیا، لیکن وزیر کے کہنے سُننے پر ملکہ کو معاف کر دیا گیا۔

دو بیٹوں کے بعد تیسری بار ملکہ کے ایک چاندسی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ ملکہ کی بہنوں نے بکری کا بچہ سب کے سامنے پیش کر دیا کہ یہی ملکہ کی تیسری اولاد ہے۔ سلطان آگ بگولا ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ ملکہ کو چوہوں سے بھری کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔

ندی کے اُس پار وزیروں کے محل تھے۔ ایک دن ایک وزیر نے دیکھا کہ ایک ٹوکری اس کے محل کے پیچھے ندی میں بہتی ہوئی آ گئی ہے۔ جب اس بند ٹوکری کو کھولا گیا تو ایک بہت ہی خوب صورت بچہ مخملی کپڑوں میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ اس نے بچے کو فوراً اٹھا لیا اور اُسے اپنی بیوی کو دے دیا۔ وزیر کی بیوی بچے کو پا کر بہت خوش ہوئی، اسی طرح تینوں بچے وزیر کے محل میں آ کر پلنے لگے۔

کچھ دن کے بعد وزیر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

ایک دن ایک بڑھیا اس محل کے دروازے پر آ کر بھیک مانگنے لگی۔ لڑکی ماشاء اللہ اب جوان ہو چکی تھی۔ لڑکی نے بڑھیا کو کھانا کھلایا اور اُسے اپنے محل میں جگہ دی۔ ایک دن عجیب و غریب چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے بڑھیا نے لڑکی کو بتایا کہ دُور بہت دُور ایک پرندہ ہے جو انسان کی بولی بولتا ہے، ایک درخت ہے جب وہ گاتا ہے تو ساری چڑیاں آ کر اس کا گانا سننے لگتی ہیں اور ایک جگہ پانی ہے جس کا رنگ زرد ہے اور اس کی ایک بوند پھوار کا کام کرتی ہے۔

''یہ تینوں چیزیں مجھے کہاں ملیں گی؟'' شہزادی نے پوچھا۔

''بیٹی، تو نے میرے ساتھ بہت ہی ہمدردی کا سلوک کیا ہے۔ اس لیے تجھے بتاتی ہوں، یہ تینوں چیزیں تجھے بھارت کے سب سے اُونچے پہاڑ پر ملیں گی۔''

شہزادی کا دل چاہا کہ ان تینوں چیزوں کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرے۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا ''مجھے یہ تینوں چیزیں چاہئیں۔ چاہے جیسے بھی ملیں۔ چاہے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔''

بڑے شہزادے نے اپنی بہن کے ہاتھ میں ایک چھری دیتے ہوئے کہا ''جب اِس چھری کی دھار کالی پڑ جائے اور اس سے خون بہنے لگے تو سمجھ لینا کہ میں مرگیا۔ دھار میں جب تک چمک باقی رہے گی، میں زندہ رہوں گا۔'' یہ کہہ کر شہزادہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان عجیب چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے نکل پڑا۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد اسے ایک بوڑھا دکھائی دیا۔ اسے بوڑھے کی داڑھی پیروں تک بڑھی ہوئی تھی۔ شہزادے نے اس کی داڑھی کے اتنے بڑھے ہوئے بالوں کو کتر کر چھوٹا کیا اور کہا ''بابا! مجھے پہاڑوں پر پہنچ کر تین عجیب وغریب چیزیں حاصل کرنی ہیں۔ کوئی ترکیب بتاؤ بابا۔

بوڑھے نے شہزادے کو ایک کٹوری دے کر کہا...... ''بیٹے! پہاڑ پر چڑھتے وقت اس کٹوری کو اپنے آگے پھینک دو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ لیکن خبردار! پیچھے مُڑ کر کبھی نہ دیکھنا!''

پہاڑ پر پہنچ کر شہزادے نے کٹوری کو اپنے سامنے پھینکا اور آگے بڑھنے لگا۔ یکا یک کئی آوازیں اس کا پیچھا کرنے لگیں ''چور! چور!! پکڑو مارو!!'' گالیاں بھی اُن آوازوں میں شامل تھیں، شہزادے سے ضبط نہ ہو سکا۔ غصّے سے تلوار کھینچ کر وہ پیچھے کی طرف مڑا۔ پیچھے مڑنا ہی تھا کہ شہزادہ گھوڑے سمیت پتھر کا بن گیا!

اُدھر شہزادی بھائی کی دی ہوئی چھری کو روز دیکھتی رہی۔ ایک دن شام کو جب دوسرے شہزادے اور بہن نے چھری کو دیکھا تو وہ سیاہ پڑ چکی تھی، اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی رونے لگے۔ چھوٹے شہزادے نے اپنی بہن کو تسلّی دیتے ہوئے کہا ''رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ موتی کی مالا لو، جس دن یہ موتی نہ پھرے سمجھ لینا میں مرگیا۔ اب میں اُن چیزوں کو حاصل

کرنے کے لیے چلا۔''

بہن نے بھائی کو لاکھ سمجھایا کہ اُسے اب وہ چیزیں نہیں چاہئیں، بھائی سے بڑھ کر وہ چیزیں نہیں ہیں، لیکن چھوٹے شہزادے نے ایک نہ مانی اور نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسے بھی وہی بوڑھا دکھائی دیا، بوڑھے نے شہزادے کو ایک کٹوری دیتے ہوئے ہدایت کی کہ پہاڑ پر چڑھتے وقت اِس کٹوری کو اپنے سامنے پھینک کر آگے بڑھنے لگے اور کسی حالت میں بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔

شہزادہ پہاڑ پر چڑھتا ہی گیا، اس پر گالیوں کی بوچھار ہونے لگی، اس نے کوئی دھیان نہ دیا۔ پھر کئی آوازیں اس کا پیچھا کرنے لگیں...... ''پکڑو، پکڑو، چور، چور ٹھہرو ابھی ہم تمھیں یہاں آنے کی سزا دیتے ہیں!'' یہ سُن کر شہزادہ بوڑھے کی نصیحت کو بھول گیا اُنھیں مارنے کے لیے جوں ہی وہ پیچھے مڑا پتھر کا بن گیا۔

اُدھر جب شہزادی نے مالا پھرائی تو موتیوں کی حرکت رُک گئی تھی۔ وہ ہلے ہی نہیں۔ شہزادی سمجھ گئی کہ یہ بھائی بھی جان کھو بیٹھا۔ اس نے سوچا جب اُس کی خواہش پوری کرنے کے لیے دونوں بھائیوں نے اپنی جانیں گنوادیں تو اس کی جان کی کیا قیمت؟ کیوں نہ وہ بھی اپنی قسمت آزما کر دیکھ لے۔

دوسرے دن شہزادی مرد کے بھیس میں گھوڑے پر سوار ہوکر بھائیوں کے راستے پر نکل گئی۔ راستے میں اسے بھی وہی بوڑھا ملا۔ اس نے نہایت ہی شفقت سے شہزادی کو سمجھایا کہ وہ پہاڑ پر نہ جائے، وہاں سے کوئی بھی لوٹ کر نہیں آسکتا۔ لیکن شہزادی نے بوڑھے کو یقین دلا دیا کہ وہ اس کی ہدایتوں پر ضرور عمل کرے گی اور پیچھے مڑ کر ہرگز نہ دیکھے گی، بوڑھے نے شہزادی کو کٹوری دے دی۔

شہزادی پہاڑ پر چڑھتی گئی۔ اس نے کٹوری اپنے آگے پھینک دی۔ گھوڑا چھلانگیں مارتا اُوپر چڑھنے لگا پیچھے سے کئی آوازیں اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ شہزادی نے اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی تاکہ آوازیں اُسے سنائی نہ دیں۔ وہ اُوپر پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑ پر پنجرے میں ایک پرندہ بیٹھا ہے، شہزادی نے پنجرے کو اُٹھا لیا اور کہا ''پرندے تُو اپنی حفاظت کے لیے بھیانک آسیب زدہ انسانوں کی بولیاں بول کر انسانوں کو خوف زدہ اور پریشان کر دیتا ہے لیکن میں تجھ پر قبضہ کر ہی چکی ہوں!''

پرندے نے کہا" تم نے مجھ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب میں تمھارا غلام ہوں، تم جو بھی حکم دوگی میں اس کی تعمیل کروں گا"

شہزادی نے کہا،" مجھے زرد پانی اور گانے والا درخت چاہیے!"

پرندے نے حکم کی تعمیل کردی۔

شہزادی نے پرندے سے پوچھا،" بتاؤ، میرے بھائی کہاں ہیں؟"

پرندہ کچھ دیر تک چُپ رہا پھر بولا،" سنو! جب تم چاروں طرف دیکھوگی تو تمھیں پانی کا ایک گھڑا دکھائی دے گا۔ اس کا پانی لے کر پتھروں پر چھڑکنے سے سارے پتھر زندہ ہو اٹھیں گے۔"

شہزادی نے پانی کا گھڑا ڈھونڈ نکالا اور پتھروں پر پانی چھڑکنے لگی۔ سارے پتھر انسان بن گئے۔ انسانوں کے اس گروہ میں شہزادی کے دونوں بھائی بھی تھے۔ شہزادی کے چہرے پر مسرّتوں کے سُورج نے سونا اُنڈیل دیا۔

شہزادی اپنے دونوں بچھڑے بھائیوں کے ساتھ اپنے محل کو لَوٹ آئی۔ اس نے پرندے کا پنجرہ اپنے کمرے میں لٹکا دیا باغ میں گانے والا درخت لگایا اور سنگِ مرمر کا فوّارہ بنوا کر اس میں زرد پانی ڈال دیا۔

ایک دن سُلطان شکار کھیلتے ہوئے شہزادوں کے محل کی طرف جا نکلا۔ دونوں شہزادے اور ان کی بہن باہر ہی کھڑے تھے۔ وہ سلطان کو پہچان کر آداب بجالائے...... سُلطان اُن کے ادب اور شائستگی سے بہت خوش ہوا اور پوچھا۔ تم کس خوش قسمت باپ کی سعادت منداولاد ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتے پرندہ اپنے پنجرے سے بول اُٹھا" شہنشاہ! آپ نے یہ کیسے یقین کرلیا کہ آپ کی ملکۂ عالم نے کتے اور بلّی کے بچّے پیدا کیے تھے؟" یہ کہہ کر پرندا نے ساری داستان بیان کردی۔ حقیقت جان کر سلطان کا سر شرم سے نیچے جھک گیا۔ اُسے اپنی سنگ دلی اور فوری فیصلے پر بہت پچھتاوا ہوا۔ اپنے پیارے بچوں کو سینے سے لگا کر وہ رو پڑا۔

سلطان اپنے دونوں شہزادوں اور چھوٹی شہزادی کے ساتھ شاہی محل میں داخل ہوا اور دوڑ کر ملکہ کے قدموں میں گر پڑا۔ بہت منّت سماجت کے ساتھ اُس نے معافی مانگی۔ غم میں گھُلتی ہوئی ملکہ

بہت ہی کمزور ہو چکی تھی، اپنے بچوں کو پا کر اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اُسے نئی زندگی مل گئی۔ سارے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ مٹھائی تقسیم کی گئی۔ غریبوں اور ناداروں کے لیے خزانوں کے در کھول دیے گئے۔ ملکہ نے اپنی دونوں بہنوں کو بھی فراخ دلی سے معاف کر دیا۔ شاہی محل میں پھر خوشیوں کے چراغ جل اُٹھے۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، اگست 1968)

●●●

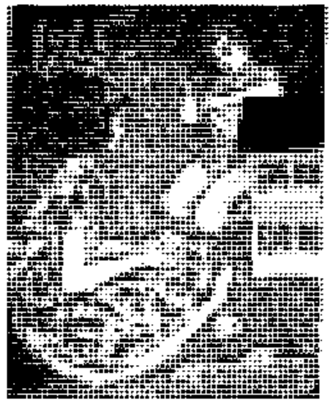

ٹینی مرغ کا بچہ

بلرام دت شرما

مالو کو اسکول کے ساتھی اکثر ''ٹینی مرغ کا بچہ'' کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ اس کے ابا جان دُبلے پتلے جسم کے تھے۔ ابا جان کے پتلے ہونے سے بیٹے پر جو طنزیہ فقرے کسے جاتے تھے، اُن سے مالو کا دل بہت دُکھی ہوتا تھا۔ اسکول میں ہر وقت ذرا ذرا سی بات پر اُسے لڑکے چڑاتے تھے۔ وہ آتا تو کہتے ''لو، دیکھو، ٹینی مرغ کا بچہ آ رہا ہے۔'' جاتا تو کہتے ٹینی مرغ کا بچہ جا رہا ہے۔'' یوں اُسے ہر وقت تنگ کیا جاتا۔

بات اسکول تک ہی رہتی تو وہ برداشت کر لیتا، لیکن اب تو پورے گاؤں میں اس کا یہ نام مشہور ہو چلا تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی اُس سے چھیڑ خانی کرنے لگیں۔ مالو سنتے سنتے بہت تنگ آ گیا۔

ایک دن مالو نے ہمت کر کے ابا جان سے پوچھا۔ ''ابا جان آپ اتنے پتلے کیوں ہیں؟''

اُس کے ابا جان پڑھے لکھے تھے۔ بچے کا یہ عجیب سوال سن کر حیران تو ہوئے، مگر سمجھانے کی خاطر نرمی کے ساتھ بولے، ''بیٹا، پتلا ہونا کوئی جُرم ہے کیا؟''

''تو پھر ابا جان، مجھے سب گاؤں والے ٹینی مرغ کا بچہ کہہ کر کیوں چھیڑتے ہیں؟''

ابا جان کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اُنھوں نے مالو کو سمجھایا۔ ''بیٹا، تو بس اتنی سی بات پر پریشان ہو گیا؟ لوگ جو کہتے ہیں کہنے دے۔ تو دل لگا کر پڑھا کر۔'' اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ابا جان کی بات سُن کر بھی مالو کو تسلی نہیں ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس کے ابا جان موٹے ہو جائیں۔ لیکن اُنھوں نے تو دل لگا کر پڑھنے کی بات کہہ کر اُسے ٹال دیا۔ وہ سوچنے لگا.....تو لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، تب ہی تو ابا جان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

وہ جتنا سوچتا، اُس کی اُلجھن زیادہ بڑھتی جاتی۔ کبھی سوچتا، ننھی مرغ کے بچے کی بساط ہی کیا؟ جب جی چاہا اس کی گردن مروڑی جاسکتی ہے۔ کبھی سوچتا، میں مرغ کا بچہ کیسے ہوسکتا ہوں؟ میں تو آدمی کا بچہ ہوں۔

وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ ایک دن اس نے میز پر اپنے ابا جان کی ڈائری دیکھی۔ اُسے پڑھنے کی کرید ہوئی۔ پہلے صفحے پر اس کے ابا جان نے لکھ رکھا تھا۔ ''اگر تم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا چاہتے ہو تو نیچے سے شروع کرو۔'' اُس نے دوسرا صفحہ کھولا۔ اُس پر تحریر تھا: ''شیر کو بھی مکھیوں سے اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔'' تیسرے صفحے کو پلٹا اور اس پر لکھی ہوئی لائن کو پڑھ کر اسے کچھ اطمینان آ گیا۔

کچھ دن بعد پاکستان نے ہندستان پر حملہ کیا۔ ٹینک دہاڑنے لگے۔ توپیں گرج اُٹھیں اور بم پھٹنے لگے۔ ریڈیو پر طرح طرح کی خبریں اور بم سے جان و مال کی حفاظت کی ترکیبوں کے پروگرام نشر ہونے لگے۔ مالو ان سب کو بڑے غور سے سُنتا اور جو بات سمجھ میں نہ آتی، اپنے ابا جان سے دریافت کر لیتا۔

ایک دن مالو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول سے لوٹنے والا تھا کہ دو تین آدمی ہانپتے کانپتے ہیڈ ماسٹر کے پاس آئے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے ''ماسٹر جی! ماسٹر جی! وہاں اُس ٹیلے پر ایک بڑا بم پڑا ہے۔''

بات ختم ہوتے ہی وہاں ایسا سناٹا چھا گیا، جیسے سچ مچ بم گرا ہو۔

ہیڈ ماسٹر نے چپراسی کو بلایا، جلدی سے نزدیک کے پولیس اسٹیشن کو پیغام لکھا اور اُسے روانہ کر دیا۔ جو لڑکے جا نہیں سکے رُک گئے۔ کچھ چلے گئے اور گاؤں میں خبر کر دی۔ لوگ اسکول میں جمع ہونے لگے ذرا سی دیر میں اسکول کا صحن گاؤں والوں سے بھر گیا۔ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ ہیڈ ماسٹر نے اُنھیں بتایا کہ بم کی خبر پولیس اسٹیشن بھیج دی ہے اور جلد ہی پولیس پہنچ جائے

گی۔ مگر لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر پولیس کے آنے سے پہلے بم پھٹ گیا تو؟

اگر اس پر ریت ڈال دی جائے تو یہ خطرہ دُور ہو سکتا ہے۔" ایک ماسٹر نے سجھاؤ دیا۔

یہ مشورہ سب ہی نے سُنا، لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ٹیلے پر جا کر اُس بم پر ریت ڈال آئے۔ سب کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ جان سب کو پیاری تھی۔ کون موت کو گلے لگائے؟ بم کا کیا بھروسا؟ ریت ڈالنے سے پہلے پھٹ گیا تو؟

"لو، ذرا میری کتابیں پکڑو" مالو نے دھیرے سے ساتھ کھڑے ہوئے لڑکے سے کہا۔ "میں ابھی اُس بم پر ریت ڈال کر آتا ہوں۔"

"تو جائے گا ریت ڈالنے؟" اُس لڑکے نے مالو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... "تو؟ ٹینی مرغ کے بچے......" لیکن وہ اُس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے مالو کو اسکول کے صحن سے باہر جاتے دیکھ لیا تھا۔ مالو کی کتابیں اُس کے پاس موجود تھیں۔

دوست کو چڑانا دوسری بات ہے، اُس کا فائدہ، نقصان سوچنا دوسری...... مالو کے ساتھی نے جب اُس کو باہر جاتے دیکھا تو اُسے مالو کے الفاظ یاد آئے۔ خوف سے وہ کانپ اُٹھا۔ زور سے چلّایا۔ "روکو! روکو! مالو کو روکو! وہ بم پر ریت ڈالنے جا رہا ہے۔"

یکا یک ہلچل پیدا ہو گئی۔ مالو کو چڑانے تو سب تھے۔ مالو کے جانے کی خبر سے سب کے دل ایک دَم دھڑک اُٹھے۔

"رُک جاؤ، مالو" ایک ساتھ کئی لڑکے چلّائے۔

"مالو، میں نے پولیس کو لکھ دیا ہے۔ لوٹ آؤ!" ہیڈ ماسٹر کی آواز گونج اُٹھی۔

لیکن مالو بھاگا جا رہا تھا۔

اس کے ابّا جان بھی موجود تھے۔ سب سے پیچھے کھڑے تھے۔ بیٹے کی بات سنی تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ وہ لوگوں کو چیرتے آگے آئے اور بیٹے کے پیچھے بھاگنے کو تیار ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے اُنھیں پکڑ لیا۔ وہ زور سے چلّائے: "مالو! او مالو! لوٹ آ!"

لیکن مالو نہیں رکا۔

"کم بخت! پلٹ آ!" اُس کے ابّا چیخے۔ "سنتا نہیں، ٹینی مرغ کے......"

آگے کی بات منظر بوجھل ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے قہقہوں میں دَب گئی۔ لیکن یہ ہنسی لمحہ بھر تھی۔ لوگ پھر فکر میں ڈوب گئے۔ بس، ایک ہی ڈر تھا...... کہیں بم پھٹ گیا تو...... اور مالو تو بچّہ ہے۔ اپنا بُرا خود نہ کر بیٹھے۔

مالو بھاگتا بھاگتا ٹیلے کے پاس پہنچا۔ چوٹی پر پڑا ہوا بم اب اُسے صاف نظر آرہا تھا۔ وہ رک گیا۔ اُسے ریڈیو پر دی جانے والی ساری ہدایتیں یاد تھیں۔ اُس نے ریت سے اپنا خالی تھیلا بھرا اور پھر بم کی جانب بھاگا۔ تھوڑی دُور پہلے سے اُس نے تھیلا آنکھوں کے آگے کرلیا اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ آگے قدم رکھنے لگا۔ اُس وقت وہ ماہر فوجی کی طرح کام سرانجام دے رہا تھا۔

بم کے پاس پہنچتے ہی وہ رُکا۔ تھیلی کی ریت اُس نے بم پر ڈال دی اور پیچھے کی جانب بھاگا۔ تھوڑی دُور رُک کر اُس نے دیکھا بم پھٹا نہیں تھا۔ وہ پھر قدم بہ قدم آگے بڑھا اور ریت ڈالنا شروع کردی۔

لیکن جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو ٹیلے کی دوسری طرف سے اُس نے گڑگڑاہٹ سی سُنی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ پولیس جیپ تھی، جو کبھی کبھی اُس کے گاؤں میں آیا کرتی تھی۔ وہ اُسی جگہ کھڑا ہوگیا۔

جیپ اس کے پاس آکر رُکی پولیس کے سپاہیوں نے اُترتے ہی اسے گھیر لیا۔ مالو کو اس کی اُمید نہ تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ پولیس افسر نے اُس سے کڑک کر پوچھا۔ ''کیا کررہا تھا یہاں؟'' مالو گھبرایا ہوا تو تھا ہی اس ڈانٹ کو سن کر کانپنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُس نے کہا۔ ''بم کو دبا رہا تھا۔''

پولیس افسر اور سپاہیوں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر افسر نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

گھبراہٹ میں مالو کے منہ سے نکل گیا۔ ''ٹینی مُرغ کا بچّہ''......''

پولیس افسر کے ساتھ سپاہی بھی ہنس دیے۔

افسر نے سپاہیوں سے بم پر کچھ اور ریت ڈلوائی اور مالو کو جیپ میں بٹھا کر اُس کے گاؤں چل دیا۔ جیسے ہی جیپ اسکول کے قریب آئی۔ مالو کے ابّا جان، ہیڈ ماسٹر اور کئی لڑکے جیپ کی طرف لپکے۔ مگر پولیس افسر نے سب کو روک دیا۔

''یہ کس کا لڑکا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میرا ہے صاحب'' مالو کے ابا جان نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''جی اس کا نام مالو ہے''

''مالو۔'' پولیس افسر بدبدایا ''لیکن یہ تو کہہ رہا تھا کہ میرا نام ٹینی مرغ کا بچہ ہے۔''

اور لوگ ایک بار پھر بم کی بات بھول کر ہنس دیے۔

''یہ تو لڑکوں نے اسے چھیڑنے کے لیے.....''

''اچھا!'' پولیس افسر ہنسا۔ پھر اُس نے مالو کو اُٹھا کر چوم لیا اور جیپ کے بونٹ پر کھڑا کر کے بولا۔ ''جانتے ہو اِس ٹینی مرغ کے بچے نے کتنا بڑا کام کیا ہے؟ اُس نے اس گاؤں کی ہی نہیں، پورے ملک کی عزت کی حفاظت کی ہے۔ خبردار، آج سے اُسے کوئی مرغ کا بچہ نہ کہے۔ یہ تو شیر کا بچہ ہے، شیر کا!''

سب لوگ رشک بھری نظروں سے مالو کو دیکھ رہے تھے۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جون 1968)

●●●

میں نے ٹیوشن کی

سید حسین احمد زاہدی

خدا آدمی کو جانور بنا دے مگر ٹیچر نہ بنائے۔ ہو سکتا ہے آپ اسے کسی دل جلے کی بکواس سمجھیں لیکن یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے وہی حضرات واقف ہیں جن کا سابقہ اس منحوس پیشے سے پڑ چکا ہو۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں خدانخواستہ کوئی پیشہ ور ٹیچر ہوں، بلکہ بچپن سے ہی (استاد کی مار کھانے کے بعد سے مجھے ٹیوشن کرنے کا شوق تھا اور اسی شوق نے مجھے اس کڑوی حقیقت کا مزہ چکھایا جس کے متعلق میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

ایک دن میں نے کچھ دوستوں کے سامنے یونہی ذکر کر دیا کہ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں اس بات کو بھول گیا۔ مگر دوسرے دن جب میں بستر پر ہی تھا تو ایک دوست آندھی طوفان کی طرح سر پر آ موجود ہوئے۔ پہلے تو میرے دیر تک سونے پر لعن طعن کی۔ پھر اس کے بعد سویرے اٹھنے کے فائدوں پر اچھا خاصا لیکچر دینا شروع کر دیا۔ میں ان کی باتوں کو غور سے سنتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوں ہاں کرتا رہا اور اپنی غلطی پر شرمندہ ہوتا رہا۔ مگر ان کا لیکچر ختم ہونے کے بجائے اور لمبا ہوتا گیا اور میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ مجبوراً ان سے اس قدر سویرے (حالانکہ اس وقت نو بج رہے تھے) آنے کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے ''ارے یار، تمھارے ہی فائدے کے لیے آیا ہوں۔ تم نے ٹیوشن کے بارے میں کہا تھا نا؟ تو میں نے ایک اچھی جگہ تمھارے لیے ٹیوشن کا بندوبست کیا ہے۔ دو لڑکے ہیں۔ دو گھنٹے پڑھانا ہوگا۔ پانچ بجے صبح کو جا کر پڑھا دینا۔

ناشتہ وہیں کر لیتا۔"

ناشتے کا ذکر سن کر تو میں بہت خوش ہوا مگر پانچ بجے پڑھانے کا سن کر ہوش اڑ گئے۔ کیونکہ جو دس بجے سو کر اٹھتا ہو اس کے لیے اتنے سویرے اٹھنے کا تصور بھی مشکل ہے۔ مگر ایک تو ٹیوشن کرنے کا شوق اور دوسرے دوست کی خفگی کا ڈر، ہاں کرتے ہی بنی۔ ادھر تو جناب رخصت ہوئے اور ادھر خیالوں میں خود کو ٹیوشن کرتے دیکھنے لگا۔

دوسرے دن گھڑی کا الارم سن کر میں چار بجے ہی اٹھ بیٹھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر غسل کیا۔ اور کپڑے بدل کر ٹیوشن پر جانے کے لیے تیار ہو گیا، کیونکہ پونے پانچ بج رہے تھے۔ مگر اب جو غور کرتا ہوں تو اپنی بیوقوفی پر سخت غصہ آیا کیونکہ مارے خوشی کے ان حضرت سے لڑکوں کے گھر کا پتہ پوچھنا ہی بھول گیا تھا اور شاید وہ غائب دماغی کی وجہ سے بتانا بھول گئے تھے۔ لہٰذا ان کو اور اپنے آپ کو برا بھلا کہتے ہوئے فوراً ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔ اٹھنے پر معافی مانگنے کے بعد کہنے لگے "کیا بتاؤں رات کو شادی کی وجہ سے زیادہ دیر تک جاگنا پڑا۔ اس لیے سویرے آنکھ نہ کھل سکی۔" پھر چونک کر بولے "ارے ہاں تم ابھی ٹیوشن پر نہیں گئے۔ یہاں کیوں چلے آئے؟

جب میں نے وجہ بتائی تو لاحول پڑھتے ہوئے بولے "واقعی یار میرا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔ خیر میں تمھارا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا۔ اب ذرا غور سے سنو کہ تمھیں جانا کہاں ہے تو سنو۔" "وہ جو پرانے چوک کا گھنٹہ گھر ہے نا—؟ ٹھیک اس کے سامنے ریلوے کا دفتر ہے۔ دفتر کے صدر دروازے کے بائیں طرف ایک گلی ہے گلی کے اس پار ایک بہت بڑا میدان ہے۔ میدان کے آخر میں ایک مندر ہے اور مندر سے ذرا ہٹ کر ایک گھنا پیپل کا درخت اور پیپل کے......"

اور پیپل کے پاس ہی ایک قبرستان ہے تاکہ مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے اگر ڈھونڈنے والے کا انتقال ہو جائے تو ایک قبر ہی نصیب ہو جائے— میں جل کر بولا۔

"ارے نہیں وہ ہنستے ہوئے بولے" تم مذاق سمجھ رہے ہو۔ اچھا ٹھہرو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

اس کے بعد ہم دونوں روانہ ہوئے۔ مگر اب جو ہم لوگ چل رہے ہیں۔ مکان تو دور کسی

جھونپڑی تک کا پتہ نہیں۔ جب بھی پوچھتا یہی کہتے ارے بس آ ہی تو گئے۔

''خدا خدا کر کے ہم دونوں ایک مکان کے پاس پہنچے۔ مجھے مکان کے اندر ایک کمرے میں بٹھا کر وہ چلے گئے، میں کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک لڑکا داخل ہوا اور بولا ماسٹر صاحب امی نے کہا ہے کہ آپ دیر سے پہنچے، ناشتہ ختم ہو چکا ہے۔''

یہ سنتے ہی مجھے سخت غصہ آیا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ میں نے کہا میں ناشتہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم لوگوں کا نیا ماسٹر ہوں۔ جاؤ جلدی کتابیں لے کر آؤ۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ابھی آیا۔'' کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور میں وقت گزارنے لگا۔ آدھے گھنٹے تک میں رسالے الٹ پلٹ کرتا رہا مگر لڑکا واپس نہیں آیا۔ انتظار کرتے کرتے میں تھک سا گیا۔ آخر مجبور ہو کر اٹھا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد حبشی کی طرح ایک شخص بدن پر تولیہ لپیٹے اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھ کر حیرت بھرے لہجے میں بولا ''ارے ماسٹر صاحب آپ موجود ہیں! لڑکے نے تو جا کر کہا تھا کہ آپ ناشتہ نہ ہونے کی وجہ سے خفا ہو کر چلے گئے۔''

میں نے کہا ''نہیں، میں تو پون گھنٹے سے بیٹھا ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ سن کر وہ حبشی ہنستا ہوا بولا ''بڑا شریر ہے۔ خیر میں ان لوگوں کو بھیج دیتا ہوں—''

اس کے بعد دونوں کتاب لے کر پڑھنے آئے۔ مگر اسی دن مجھے معلوم ہو گیا کہ ٹیوشن کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ پہلے ہی دن ایک نے پڑھتے پڑھتے دوسرے کو اشارہ کیا ماسٹر صاحب خبطی ہیں۔ دوسرے نے فوراً پہلے والے کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیے یہ آپ کو خبطی کہہ رہا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ پہلا جھٹ بول اٹھا—اور تم نے نہیں کہا تھا کہ ''ماسٹر صاحب الو ہیں۔''

''پہلے تو تم نے ماسٹر صاحب کو بندر کہا تھا۔'' دوسرے نے فوراً کہا۔

''بندر تو تم نے کہا تھا۔'' پہلا بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا اور اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے لگے اور بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ ایک نے قریب رکھا ہوا میرا جوتا اٹھا کر دوسرے کے پھینک مارا۔ اس نے جوتا پھینکتے دیکھ لیا تھا اس لیے جھک گیا اور جوتا پچھتر ڈگری کا زاویہ بناتا ہوا سیدھا میرے سر پر آ لگا، جوتا چونکہ پوری طاقت سے پھینکا گیا تھا اس لیے اتنی زور سے لگا کہ پہلے تو میں اپنی جگہ پر چرخی کی طرح ایک چکر گھوم گیا اور اس کے بعد منہ کے بل زمین پر

آرہا۔ مجھے گرتا دیکھ کر جوتا پھینکنے والے نے ہنس کر دوسرے سے کہا" دیکھا جس کا جوتا اسی کے سر۔ میں نے زندہ مثال پیش کر دی۔ تم کچھ نہ کر سکے۔"

دوسرے نے پہلے کو بازی مارتے دیکھ کر کہا۔ "میں کون سا کم ہوں" اور اس سے پہلے کہ اسے میں روکتا اس نے جوتا اٹھا کر اس زناٹے سے میرے سر پر پھینکا کہ میں چوٹ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے سر میں گومڑا پڑ گیا ہے اور حبشی اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لڑکوں کو ڈانٹ رہا ہے۔ "کم بختو! تم لوگوں کو شرم نہیں آتی ماسٹر صاحب سے مذاق کرتے ہوئے! مارنا تھا تو ایک جوتا کافی تھا دو جوتے مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

دوسرے لڑکے نے اپنی صفائی میں کہا" واہ، یہ میں کس طرح دیکھ سکتا تھا کہ ماسٹر صاحب میری خدمت سے محروم رہیں۔ میں نے بھی اپنا فرض پورا کر دیا۔"

حبشی نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر صاحب برا نہ مانیے گا۔ آپ ہی کا بچہ ہے۔ ذرا شریر ہے۔ بڑا ہونے کے بعد خود ٹھیک ہو جائے گا"

میں نے اپنے بچے پر لاحول پڑھی اور فوراً وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا کہ کہیں وہ دونوں میری خدمت کرنی شروع نہ کر دیں اور میں اپنا چہرہ کسی کو بھی دکھانے کے قابل نہ رہوں۔

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، جولائی 1972)

●●●

زندگی کے میلے

فیصل نعیم

"آصف! آصف! کیا کل شام کو میلہ دیکھنے نہیں چلو گے؟" خالد نے سائیکل سے اترتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ہاف آستین کی شرٹ اور سفید نیکر پہنے ہوئے تھا۔ وہ ہاکی کھیل کر آ رہا تھا کیونکہ سائیکل کے اسٹینڈ کے پیچھے اس کی گرین ہاکی رکھی ہوئی تھی۔

"دوست! دل تو میرا بہت چاہ رہا ہے میلہ دیکھنے کو لیکن کیا کروں میرے پاس میلہ دیکھنے کے لیے پیسے بالکل نہیں ہیں۔" آصف اداس لہجے میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں کاپی اور قلم تھا۔ اس وقت وہ ٹیوشن پڑھ کر آ رہا تھا۔

"تو پھر تم میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟" خالد نے آصف کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں دوست! مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمھارے ساتھ میلہ دیکھنے نہیں جا سکوں گا۔" آصف نے سر جھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تو دوست اس میں دل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم اپنے گھر والوں سے پیسے لے لینا۔" خالد نے آصف کی ہمت بندھائی۔

"لیکن گھر والے پیسے نہیں دیں گے۔ تمھیں پتہ ہی ہے، ششماہی امتحان میں کم نمبر لانے پر ابا جان سخت خفا ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے میرا جیب خرچ اس وقت تک کے لیے بند کر دیا

ہے، جب تک کہ میں سالانہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل نہیں کر لیتا۔ اس وقت بھی میں آپا کے پاس سے ٹیوشن پڑھ کر آ رہا ہوں۔'' آصف نے افسردہ لہجے میں خالد کو بتایا۔

''حیرت ہے اتنی سی بات پر تمھارے ابا جان نے تمھارا جیب خرچ بند کر دیا۔'' خالد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر وہ آصف سے بولا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میلہ دیکھنے نہیں جا سکتے۔؟''

''ہاں دوست! مجبوری ہے۔!'' آصف نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''ویسے تم ایک طریقے سے پیسے حاصل کر سکتے ہو!!'' خالد نے آصف کے قریب منہ لے جا کر آہستگی سے کہا۔

''کون سا طریقہ؟'' آصف نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارے ابا پیسوں والا بٹوا کہاں رکھتے ہیں؟'' خالد نے بڑے رازدارانہ لہجے میں آصف سے کہا۔

''اپنی قمیض کی جیب میں۔'' آصف اتنا کہہ کر ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خالد سے پوچھا۔ ''لیکن تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟۔''

''اس لیے کہ میں تمھیں میلے لے جانا چاہتا ہوں۔'' خالد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن ابا کے بٹوے کا میلے سے کیا تعلق ہے؟'' آصف نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اماں یار تم بھی بڑے بھولے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم ابا جان کے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال لینا۔'' خالد سرگوشی میں بولا۔

''نن.....نن.....نہیں! یہ تو چوری ہوئی میں یہ کام نہیں کر سکتا۔'' آصف نے گھبرائے ہوئے لہجے میں گردن کو نفی کے انداز میں ادھر ادھر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو تمھاری مرضی۔ میں نے یہ تو اس لیے کہا تھا کہ تم اس طرح میلہ دیکھ سکو گے۔ ویسے اگر تم افریقہ کے سفید بندر، آسٹریلین توتے اور ڈولفن مچھلی کے دلفریب کرتب نہیں دیکھنا چاہتے تو تمھاری مرضی۔ اچھا بھائی خدا حافظ! میں تو گھر چلا۔'' خالد نے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آصف نے خالد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خالد نے سائیکل چلا دی پھر اس نے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے کہا ''میری بات اگر تمھاری سمجھ میں آجائے تو

پھر میں کل شام کو تمھارا انتظار کروں گا۔" اتنا کہہ کر خالد سائیکل بھگاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آصف گھر آیا تو اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ دل کہتا تھا کہ خالد کی بات مان لو جبکہ دماغ کہتا کہ نہیں یہ بری عادت ہے اور چوری کرنا خود ایک برائی ہے۔ جو چوری کرتا ہے وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ ایک طرف میلے میں رنگ برنگی دلفریب چیزیں دیکھنے کا شوق یعنی دل کی یہ آواز کہ پیسے چوری کر کے میلہ دیکھا جائے، میلے کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوا جائے۔

رات بھر آصف کے دل و دماغ میں جنگ ہوتی رہی۔ بالآخر آصف کے اندر کی سچائی جیت گئی۔ اس نے اپنے امی ابا کے سامنے خالد کے ساتھ کی گئی ساری گفتگو دہرادی۔ جب وہ یہ باتیں بتا رہا تھا تو اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

"ابو! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں آئندہ خالد جیسے دوست نہیں بناؤں گا۔ اس نے مجھے بری بات کی ترغیب دی۔ وہ میرا اچھا دوست نہیں ہے۔"

"ہے نا ابو! آصف ابو کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے کہ خدا نے تمھاری آنکھیں کھول دیں۔ اور تم نے اچھے اور برے دوست کی پہچان کر لی۔" آصف کے ابو شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"ابو! آپ نے مجھے معاف کر دیا نا!"

"ہاں بیٹا! تم نے بہت سچائی سے ساری بات بتا کر مجھے خوش کر دیا۔" اتنا کہہ کر ابو ایک لمحے کو خاموش ہوئے پھر دوسرے لمحے وہ آصف کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"دیکھو بیٹے! زندگی بھی ایک میلہ ہے۔ اس میلے میں نیکی اور بدی ایک دوسرے کے مقابل جنگ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کچھ لوگ نیکی کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ بدی کے ساتھ اس لیے جو ایک دفعہ اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے وہ اپنے خدا کو بھول جاتا ہے۔ دنیا میں اپنے آنے کے مقصد کو فراموش کر دیتا ہے نتیجتاً وہ بدی کا ساتھ دینے لگتا ہے جبکہ نیکی کی راہ پر چلنے والے لوگوں کو بھی برائیوں سے بچاتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں ہر قسم کی مشکلات اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ خود کو بھی برائی سے بچایا جائے اور دوسروں کو بھی برائی سے بچایا جائے۔

''ابو کے خاموش ہوتے ہی آصف مضبوط لہجے میں بولا۔''

''ابو! میں نیکی کا ساتھ دوں گا۔ابو زندگی کے میلے میں سفر کرتے ہوئے میرا ہر قدم برائی سے بچتے اور دوسروں کو بچاتے ہوئے آگے بڑھے گا۔میں حق کی روشنی اور سچائی کا اجالا بنوں گا۔

''ابو......سب کو برے راستے پر چلنے سے بچاؤں گا ابو......خالد کو بھی ......اور......سب کو ابو اور اپنے آپ کو بھی انشاءاللہ۔

نئے دن کا سورج چاروں طرف نئی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ایسی ہی کرنیں آصف کے اندر سے بھی پھوٹ رہی تھیں۔۔نئے جذبوں،نئی امنگوں،نئے حوصلوں اور ایک عزم کے ساتھ۔

(ماہنامہ ''بچوں کا ہلال''،رام پور،مئی 2009)

●●●

بُری بچّی

ہے ایک چھوٹی سی لڑکی   شوخ شریر اور ضدی سی
ضد کرنا اُس کا ہے کام   ہے گھر میں بے حد بدنام
ضِد سے گر اس کو روکیں   ابّا یا امّی ٹوکیں
رُوں رُوں کرنے لگتی ہے   آہیں بھرنے لگتی ہے
لے کر جب بھی اُس کا نام   کہہ دیں کرنے کو کوئی کام
کوئی بہانہ کرتی ہے   کام کے نام سے ڈرتی ہے
ابا بھی ہیں اُس سے خفا   امّی بھی ناراض جُدا
پِٹتی ہے بھیا سے بھی   ناخوش ہیں اس سے باجی
کھینچتے ہیں سب اُس کا کان   اور کہتے ہیں دور دفعان
مار کے صدمے سہتی ہے
اکثر روتی رہتی ہے

●●●

عقلمند بچہ

ڈاکٹر نواز دیوبندی

مصر میں ایک بہت بڑا دریا ہے، جس کا نام نیل ہے۔ اگلے وقتوں میں دریائے نیل کے قریب ایک شہر تھا۔ اس شہر میں بہت دن پہلے ایک بے دین آدمی آیا۔ وہ آدمی پڑھا لکھا تو بہت تھا مگر تھا بے دین۔ اس شخص نے مصر کے عالموں سے تین سوال کیے مگر کوئی بھی ان سوالوں کا صحیح جواب نہیں دے سکا۔ وہ بے دین آدمی بازار میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو جاتا اور ڈینگیں مارتا۔ ایک دن وہ اسی جگہ پر کھڑے ہو کر کہنے لگا ''ہے کوئی ایسا جو میرے سوالوں کا جواب دے سکے؟

ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''میں تمھارے سوالوں کا جواب دے دوں گا۔''

اس لڑکے کو دیکھ کر ادھر ادھر کے لوگ وہاں جمع ہو گئے اور تعجب کے ساتھ بولے ''لڑکے کیا سچ مچ سوالوں کے جواب دو گے؟''

لڑکے نے جواب دیا ''انشاءاللہ''

بے دین نے اس بچے سے پوچھا ''پہلا سوال یہ ہے کہ اس وقت تمھارا خدا کیا کر رہا ہے؟''

لڑکے نے کہا ''پوچھنے والے کا درجہ بتانے والے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے آپ نیچے آئیں اور میں اونچائی پر آتا ہوں۔''

اس آدمی نے کہا ٹھیک ہے اور نیچے اتر آیا۔

لڑکا اونچائی پر چڑھ آیا۔ پھر بولا ''جناب میرا خدا اس وقت ایک بے دین کا رتبہ گھٹا کر ایک لڑکے کا رتبہ بڑھا رہا ہے۔''

لوگوں نے جب یہ سنا تو واہ واہ کرنے لگے۔ بے دین شرما کر رہ گیا۔

اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''خدا سے پہلے کیا تھا؟''

لڑکے نے جواب دیا ''جناب ذرا آپ پانچ سے شروع کر کے الٹی گنتی گنیں۔''

آدمی گننے لگا ''پانچ، چار، تین، دو، ایک۔'' اور پھر چپ ہو گیا۔

لڑکے نے کہا ''اور ایک سے پہلے؟'' اس آدمی نے جواب دیا۔ ایک سے پہلے کوئی گنتی نہیں ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا تو خدا بھی ایک ہے۔ اس سے پہلے ہو ہی کیا سکتا ہے۔''

لڑکے کا یہ جواب سن کر وہ بے دین بہت بوکھلایا۔ سننے والے اتنے ہی خوش ہوئے۔

اب اس آدمی نے تیسرا سوال کیا ''خدا کا منہ کس طرف ہے؟''

اس سوال کا جواب دینے کے لیے لڑکے نے موم بتی منگائی اور موم بتی کو جلایا۔ پھر بے دین سے پوچھا۔ ''جناب، بتایئے اس کی روشنی کا منہ کس طرف ہے؟''

بے دین بولا ''چاروں طرف ہے''

لڑکے نے کہا ''خدا بھی تو ایک نور ہی ہے۔ اس کا منہ بھی ہر طرف ہے۔''

لڑکے کا جواب سن کر بے دین ہکا بکا رہ گیا۔ اپنی ہار پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا ''تم نے مجھے بھٹکے ہوئے راستے سے ہٹا کر سیدھا راستہ دکھا دیا۔ میں عمر بھر تمھارا احسان مند رہوں گا۔''

جانتے ہو بچو، یہ صاحب زادے کون تھے؟ یہ تھے حضرت امام ابوحنیفہؒ، جنھوں نے بڑے ہو کر بہت عزت پائی۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جولائی 1983)

●●●

بندر کا انصاف

بندر کا انصاف

فیروز بخت احمد

ننی خرگوش بڑی پریشانی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ پچھلے چھ سات دن سے اس کے باغ میں سے کوئی کٹہل چرا کر لے جا رہا تھا۔ پہلے دن تو اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر جب ایسا ہوتے ہوئے کئی دن گزر گئے تو اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ سخت سردیوں کے دن تھے اس لیے وہ باغ میں رات کو پہرہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟

اس کے باغ کی ایک طرف تو لالو لومڑ تھا اور دوسری طرف ڈم ڈم بھالو۔ جب وہ ان دونوں سے پوچھتا تو دونوں ہی ٹکا سا جواب دیتے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس نے سوچا کیوں نہ جنگل کی عدالت میں اس کی شکایت کر دی جائے۔ اسے ان دونوں پر ہی شک تھا کیونکہ پچھلے مہینے ہی اس کی لڑائی ان دونوں سے نہر کا پانی لینے پر ہوئی تھی۔ جنگل کی عدالت کا جج بندر تھا جس کا نام میکو تھا۔ وہ اسی طرح کئی جھگڑوں کا نپٹارا کر چکا تھا۔

جب وہ بندر کے گھر گیا تو بندر دیکھتے ہی بولا۔ ”آؤ آؤ! گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟ چہرہ بھی کچھ اترا اترا سا نظر آ رہا ہے۔

”گھر پر تو خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہے مگر ایک اور چکر آ پڑا ہے۔“ ننی نے ساری بات میکو کو بتا دی کہ کس طرح اس کے کٹہل چوری ہوتے رہے۔

ساری بات سن کر بندر نے کچھ سوچا پھر بولا، ”تم ایسا کرو کہ ان دونوں کو بڑے برگد کے نیچے

بلالو۔ وہاں پر عدالت بیٹھے گی۔ پھر فیصلہ سنادیا جائے گا۔"

بنی بندر کو سلام کر کے واپس آ گیا۔ دوسرے دن برگد کے پیڑ کے نیچے جنگل میں عدالت بٹھائی گئی۔ تھوڑی دیر میں بنی ڈم ڈم بھالو اور لالو لومڑ کو لے آیا۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوگئی۔ میکو نے سب جانوروں کو پوری بات بتادی سب نے درخواست کی کہ بندر اس کا فیصلہ کرے۔ میکو بندر اطمینان سے اٹھا اور ان دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔" جاؤتم دونوں اپنے اپنے گھروں سے سبزی کاٹنے والے چاقو لے آؤ۔"

پھر وہ پاس بیٹھے ہرن سے بولا" جاؤ ذرا دوڑ کر نیبو تو لے آؤ۔"

ہرن دوڑ کر دو نیبو لے آیا۔ اور ڈم ڈم بھالو لالو لومڑ بھی اپنے چاقو لے آئے سارے جانور سانس روکے اس کام کو دیکھ رہے تھے۔

میکو نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ اب میں منتر پڑھ کر دونوں چاقوؤں پر پھونک ماروں گا۔ تب دونوں اپنے اپنے چاقوؤں سے نیبو کاٹیں گے۔ جو چور ہوگا اس کا نیبو خون سے سن جائے گا۔ جو چور نہیں ہوگا اس کے نیبو سے خون کے بجائے رس نکلے گا۔

تب بندر نے بدبداتے ہوئے چاقوؤں پر پھونک ماری۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے اپنے نیبو کاٹے۔ ارے! یہ کیا؟ سب نے آنکھیں مل مل کر دیکھا لالو لومڑ کے نیبو سے رس کے بجائے خون نکل رہا تھا۔

لومڑ گھبرا کر اپنا جرم قبول کرلیا۔ بندر نے فوراً لومڑ کو اپنی اگلی فصل کا آدھا حصہ دینے کی سزا دی۔ بعد میں خرگوش نے بندر سے پوچھا" میکو بھیا کیا سچ مچ تمھارے منتر پڑھنے سے لومڑ کے نیبو سے خون بہنے لگا تھا۔؟"

میکو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" ارے نہیں بدھو! وہ تو محض ایک ناٹک تھا۔ شاید تجھے نہیں پتہ کہ کٹھل کا رس اور نیبو کا رس مل کر خون سا بن جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ چور نے گھر جا کر کٹھل کو چاقو سے ضرور کاٹا ہوگا۔

کاٹنے سے کٹھل کا رس چاقو پر چپک گیا ہوگا اس لیے میں نے ان سے نیبو کاٹنے کو کہا تھا۔ وہ سمجھے کہ میرے پھونک مارنے سے ایسا ہوا تھا۔ اس طرح سے چور پکڑا گیا۔"

اس ترکیب سے نبی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا اور اس نے میکو کی دعوت کی۔ لومڑ پورے جنگل میں ذلیل ہو گیا۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ چوری کرنا بہت برا ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ کسی کو چوری کی عادت نہ پڑے۔

(ماہنامہ "جنت کا پھول"، رام پور، نومبر 1973)

●●●

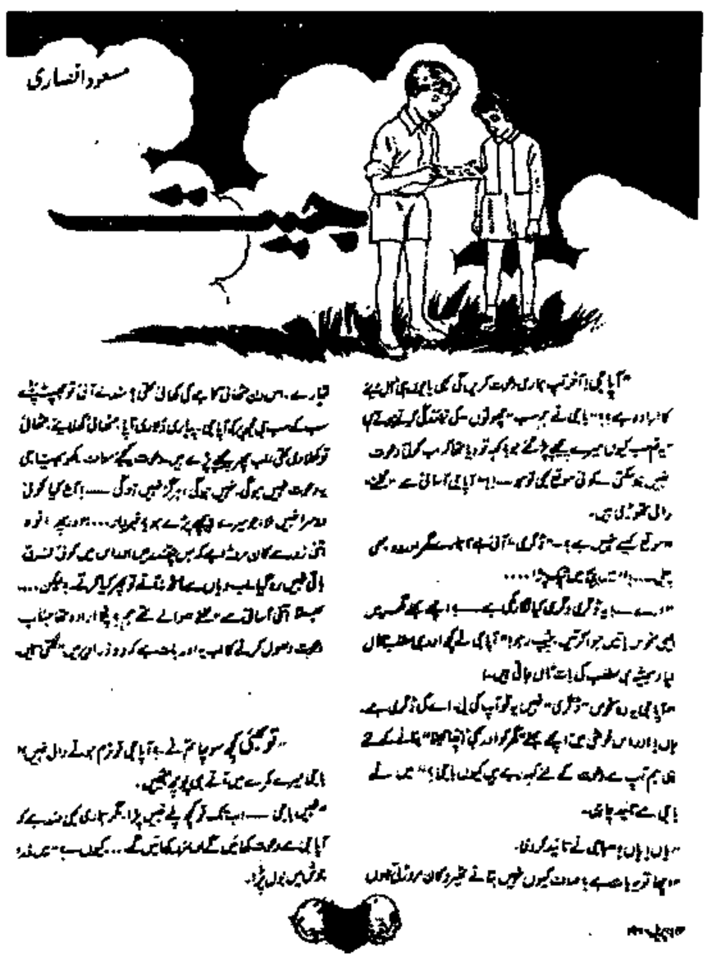

نیکی کا پھل

پروانہ ردولوی

یہ اس زمانے کی بات ہے۔

جب نہ ہوائی جہاز تھے نہ پانی کے جہاز۔ نہ ایٹم بم تھے نہ ہائیڈروجن بم۔ نہ خلائی جہاز تھے نہ راکٹ موٹر، کاریں، جیپیں، ٹرینیں اور سائیکلیں تو بڑی چیزیں ہیں بیل گاڑیاں بھی نہ تھیں۔ اس زمانہ میں لوگ جنگلوں میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں اور بندرگاہوں کی جگہ پر خوفناک جنگل اور ویران چٹانیں وغیرہ تھیں لیکن انسان اس زمانے میں بھی زیبائش کو پسند کرتا تھا۔ عورتیں طرح طرح کے رنگ برنگے پتھروں کو رگڑ کر ان کے زیورات بناتی تھیں۔ مرد بھی جنگلی درندوں کی ہڈیوں اور جڑی بوٹیوں کو کسی درخت کی چھال کے ریشے نکال کر ان پر گوندھتے تھے اور عجیب و غریب مالائیں پہنا کرتے تھے۔

پتھروں کو رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی تھی اور چونکہ برتن وغیرہ اس زمانے میں ایجاد نہیں ہو سکے تھے اس لیے لوگ پرندوں اور جانوروں کو آگ میں بھون کر کھایا کرتے تھے۔

اس دور میں لوگ مختلف قبیلوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر قبیلے اور گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا جسے اس کی اطاعت قبول کرنے والے لوگ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ اس سردار کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور کوئی بھی جھگڑا نہ اقوام متحدہ میں جاتا تھا نہ کسی اعلیٰ و ادنیٰ عدالت میں بلکہ قبیلے کے سردار کے سپرد کر دیا جاتا تھا اور اس کا فیصلہ ہی سب کچھ ہوتا تھا۔

اکثر قبیلے اپنے سرداروں کی پوجا پرستش کرتے تھے اور ان کے احکامات کو خدائی احکامات سمجھ کر ان پر عمل کرتے تھے۔ وہ عجیب دنیا تھی۔ نہ عالمگیر جنگ کے خطرات تھے نہ انسان کے تباہ و برباد ہونے کے شبہات۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ اکثر مختلف قبیلوں کے درمیان خوفناک جھڑپیں ہو جاتی تھیں لیکن یہ جھڑپیں اتنے محدود علاقے میں ہوتی تھیں کہ ایک جنگل میں ہونے والی جھڑپ کا علم تھوڑے فاصلے پر واقع دوسرے جنگل میں رہنے والوں کو کوئی دیر کے بعد ہوا کرتا تھا۔ ان مقابلوں یا جھڑپوں میں نکیلے پتھروں۔ لکڑی کے تیروں اور خاردار ڈنڈوں ہی کا استعمال ہوتا رہا ہوگا اس لیے یقینی طور پر بہت کم لوگ ہلاک ہوتے ہوں گے۔ پھر بھی جنگ بہر حال بری چیز ہے اور وہ زمانہ بھی ان برائیوں سے پاک نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ حالت بدلے اور انسان پتھروں سے دھاتوں کے دور میں داخل ہو گیا۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا پتہ لگا تو مال و دولت حاصل کرنے کے لیے جھگڑے بڑھنے لگے۔ لیکن قبائلی طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے سے جو لڑائی ہوتی اس میں تیر کمان، بھالے اور تلواریں استعمال کی جاتیں اور اس مقابلے میں کافی جانی و مالی نقصان ہوتا۔ یہ زمانہ بھی پتھروں کے زمانہ ہی کی طرح بڑا طویل تھا۔ اور اس زمانہ کے لوگ خود کو بہت ترقی یافتہ سمجھتے تھے لیکن تم ہی بتاؤ کہ آج کے دور کے مقابلہ میں اس دور کی کیا وقعت ہے بہر حال ہر نئی چیز پرانی بنتی جائے گی اور ہر پرانی بات داستان بنتی جائے گی۔ انسان کی فکر و تلاش کا جذبہ نئے نئے مسائل بھی پیدا کرتا رہے گا اور کچھ پرانے مسائل کو حل بھی کرتا رہے گا۔ لیکن ہم تو بات کر رہے تھے اس زمانے کی جب سونے چاندی فولاد تانبے پیتل اور ہیرے جواہرات کا پتہ چل گیا تھا اور ان چیزوں کے لیے مختلف قبیلوں کے درمیان بڑی بڑی جنگیں ہوتی تھیں۔ اسی زمانے میں اپنے ملک ہندوستان میں ہمالیہ کی وادی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ اس کا نام تھا ساوتری۔۔۔ اس کا شوہر بڑا بہادر اور جنگجو انسان تھا اور اس کے گھر میں دولت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اگر ساوتری چاہتی تو وہ ساری عمر اپنے شوہر کی جمع کی ہوئی دولت کے سہارے عیش و آرام سے زندگی گزار دیتی مگر وہ بے انتہا رحم دل اور نیک عورت تھی۔ کوئی ضرورت مند بھی چاہے وہ جس رنگ و نسل کا ہو اس کے دروازے پر آکر مایوس واپس نہیں ہوتا تھا۔

لوگ جوق در جوق ساوتری کے گھر پر آتے۔ اسے اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں سے آگاہ

کرتے اور ساوتری غور سے ان کی باتیں سننے کے بعد انھیں کھانا کھلاتی اور حسب ضرورت رقم دے کر رخصت کر دیتی اس کی رحم دلی اور خدمت خلق کے چرچے دور دور تک تھے۔ ایک روز ساوتری اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی اس نے دیکھا کہ نرم وگداز گھاس پر ایک زخمی چڑیا پڑی ہوئی پھڑ پھڑا رہی ہے۔ ساوتری نے چڑیا بڑی احتیاط سے اٹھایا اور اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ وہاں اس نے چڑیا کے زخموں کی مرہم پٹی گرم دودھ پلایا اور اس وقت تک اپنے ہاتھوں میں رکھا جب تک اس کے جسم میں گرمی نہ پہنچ جائے۔ ایک مہینے تک ساوتری نے اس چڑیا کی خدمت کی یہاں تک کہ وہ چڑیا اڑنے کے قابل ہو گئی۔

ایک دن چڑیا ساوتری کے شانے پر بیٹھی اور ساوتری کے گالوں کو چونچ سے مس کرنے لگی جیسے الوداعی بوسے لے رہی ہو پھر اڑ گئی۔

کئی سال گزر گئے۔ ساوتری کی کوئی آمدنی تو تھی نہیں وہ تو اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی دولت ہی کو خرچ کر رہی تھی اس لیے رفتہ رفتہ وہ غریب ہو گئی تھی۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب اس کے گھر میں ایک دانہ بھی نہ رہ گیا۔ بھوک ایک ایسی خواہش ہے جس سے کسی شخص کا بھی بچنا مشکل ہے ساوتری کو بھوک نے جب بہت ستایا تو اپنے دوستوں رشتے داروں سے اس نے کھانا لینا شروع کیا لیکن سب لوگ تو ساوتری کی طرح رحم دل تھے نہیں اس لیے ایک دن ایسا بھی آیا جب تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے ساوتری کو کھانا دینا بند کر دیا اور وہ کئی دن تک بھوکی رہی۔ ایک روز صبح کو وہ بہت اداس اور مایوس اپنے باغ کے ایک گوشے میں بیٹھی تھی اچانک کوئی چیز آ کر اس کے کندھے پر بیٹھ گئی۔ گھبرا کر اس نے شانے پر نظر ڈالی تو ایک چڑیا بیٹھی ہوئی نظر آئی اور اس نے اندازہ لگا لیا یہ وہی چڑیا ہے جس کی برسوں قبل اس نے خدمت کی تھی۔ چڑیا نے تھوڑی دیر تک ساوتری کے شانے پر آرام کیا اس کے بعد اپنی چونچ سے کوئی چیز ساوتری کے ہاتھ پر پھینکی اور اڑ گئی۔ ساوتری نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا بیج تھا۔ وہ مسکرائی اور یہ سمجھی کہ چونکہ اس نے چڑیا کی ایک عرصے تک خدمت کی تھی اس لیے آج وہ احسان اتار گئی ہے۔ اس نے بیج کو اپنے قریب ہی زمین کھود کر گاڑ دیا اور اٹھ کر گھر چلی گئی ——پھر وہ اس واقعے کو بھول گئی۔

لیکن —— ایک دن ایک مسافر اس کے گھر پر آیا اور اس سے کچھ کھانے کے لیے مانگا۔ اس روز

بھی ساوتری کے گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا وہ بہت پریشان ہوئی اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرا کہ ''ایک مہمان کو وہ اپنے گھر سے کیسے مایوس و نامراد واپس کر دے؟'' جلدی جلدی وہ اپنے باغ میں یہ دیکھنے گئی کہ اگر کسی درخت میں کوئی پھل ہو تو توڑ کر لے آئے اور مہمان کی خاطر مدارات کرے۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اس میں ایک ایسی تربوز کی بیل پھیلی ہوئی ہے جو اس سے پہلے کسی نے باغ میں نہیں دیکھی تھی۔ اس تربوز کی بیل میں ایک پکا ہوا تربوز بھی لگا تھا۔ اس نے یہ توڑ لیا اور خوشی خوشی گھر واپس ہوئی۔ اس نے تربوز کو مہمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں!'' اس لیے جیسے ہی ایک چھری سے تربوز کو کاٹا اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تربوز کے اندر۔ سے ہیرے جواہرات اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والے قیمتی پتھر نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ اس نے حیرت سے مہمان کی جانب دیکھا لیکن اس مہمان نے مسکرا کر کہا۔ ساوتری یہ تمھاری نیکیوں اور مہربانیوں کا پھل ہے!'' اور یہ کہہ کر وہ مہمان پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، مارچ، 1963)

●●●

شیطانی عمل

مناظر عاشق ہرگانوی

ان دنوں، مشہور جاسوس راشد کو کوئی کام نہیں تھا۔ بیکاری میں زیادہ وقت وہ اپنے کروپ نگر کے دفتر میں گزار رہا تھا۔

ایک دن وہ اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی اس کے آفس میں داخل ہوا اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''حضور، مائی، باپ۔''

''کیا بات ہے؟'' راشد نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''حضور، میں لٹ گیا۔ آپ کے پاس بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ آپ بڑے جاسوس ہیں مجھ غریب پر بھی رحم کیجیے حضور......''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' راشد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا پہلے تم اپنا نام بتاؤ اور پوری بات سے آگاہ کرو، پھر میں دیکھوں گا کہ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں!''

''حضور میرا نام فضلو ہے۔ میں کاغذی محلہ میں رہتا ہوں اور یہاں چوک پر امام صاحب کی کپڑے کی دکان میں کام کرتا ہوں۔ گھر میں صرف بوڑھی ماں ہے وہ محلے کے گھروں میں کام کرتی ہے۔ ابھی پندرہ دن پہلے کی بات ہے ایک شام جب وہ کسی گھر میں کام کرنے گئی تو بند بکس میں سے سب گہنے اور روپے کسی نے چرا لیے۔ حضور میری ماں، میری شادی کرنے کے لے یہ سب جمع

کر رہی تھی۔ گہنے میری ماں کی شادی کے وقت کے تھے حضور آپ بڑے جاسوس ہیں۔ آپ کے لیے یہ چھوٹا کام ہے۔ لیکن میری ماں کی زندگی بھر کی اور میری اب تک کی کمائی چلی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں مجھے واپس دلوا دیجیے۔ اللہ اس کا ثواب دے گا۔"

"تم نے تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوادی ہے؟۔" راشد نے پوچھا۔

"جی حضور،" "لیکن انسپکٹر صاحب کہتے ہیں چور کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔"

"اچھا، گھبراؤ نہیں۔ میں خود تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" راشد کو اس غریب پر ترس آ گیا اور وہ پولیس انسپکٹر ساتھ لے کر کاغذی محلہ پہنچ گیا۔ اس محلے میں زیادہ تر کم پڑھے لکھے اور مزدور لوگ رہتے تھے۔ فضلو کے گھر پہنچنے پر راشد نے اس کی ماں سے پوچھا "تمھیں کسی شخص پر چوری کرنے کا شک تو نہیں ہے؟۔"

"نہیں سرکار، میرے گھر سے بھلا کون چرا کر لے جائے گا۔ یہ تو شیطان کا کام ہے۔ میں فضلو کو شروع سے سمجھاتی رہی ہوں۔ لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔"

"شیطان کا کام؟ میں نہیں سمجھا۔" راشد نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں سرکار، اس گھر میں آسیب رہنے لگے ہیں اور یہاں عجیب عجیب واقعات ہو رہے ہیں۔" "ایک دن میں جب سویرے سو کر اٹھی تو میری چارپائی کے نیچے سندور میں رنگے کچھ پھول، گندے بال، ہڈی کے ٹکڑے، لیموں کی پھانکیں اور پھٹے پرانے کپڑوں کے چیتھڑے رکھے تھے۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر میں ڈر سے کانپنے لگی۔ میں نے پڑوس کی شریفن کو بلا کر یہ سب چیزیں دکھائیں تو اس نے بتایا کہ یہ ضرور شیطانی عمل ہے۔ وہی مولوی کرامت صاحب کی خوشامد کر کے انھیں یہاں لائی۔ مولوی صاحب نے بھی یہی کہا یہ شیطان کا کام ہے۔ میرے کہنے پر مولوی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ اس گھر سے شیطان کو بھگانے کی کوشش کریں گے۔ اور......"

"شریفن کون ہے؟" راشد نے بیچ میں ہی سوال کیا۔

"پڑوس کے مکان میں رہتی ہے۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے — ایک بیٹا تھا، وہ چار سال پہلے بمبئی بھاگ گیا — اب تک پتہ نہیں ہے۔ وہ بے چاری مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے۔" فضلو نے جواب دیا۔

''اچھا پھر کیا ہوا؟ راشد نے فضلو کی ماں سے پوچھا۔''

''پھر وہی ہوا جو میری پھوٹی تقدیر میں لکھا تھا۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بتایا۔''

ایک دن شام کو جب میں گھر لوٹی تو دروازے کے سامنے سندور چھڑکا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو میں چونک پڑی۔ اندر کمرے میں لکڑی کے بکس پر بھی سندور پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے بکس کا تالا کھولا اور گہنے کی پوٹلی ٹٹولی تو پوٹلی مل گئی۔ لیکن اس پر بھی سندور چھڑکا ہوا تھا اور پوٹلی خالی تھی۔ البتہ بکس کے اندر پھول، لیموں کی پھانکیں، راکھ، ہڈی کا ٹکڑا اور کپڑے چیتھڑے رکھے ہوئے تھے۔''

چند لمحے کے لیے فضا میں خاموشی چھا گئی۔ آخر راشد نے ہی پوچھا ''پھر کیا ہوا؟۔''

''میں نے فوراً شریفین کو آواز دی۔ لیکن وہ بے چاری کر ہی کیا سکتی تھی۔ شیطانی عمل کے سامنے ہمارا بس چلے تب نا، ویسے مولوی صاحب.....''

''یہ سب بکواس ہے۔'' فضلو نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا کسی نے چوری کی ہے اور ہم سب کو الّو بنانے کے لیے شیطانی عمل کا ڈھونگ رچایا ہے۔''

تھوڑی دیر تک راشد کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے شریفین کو بلانے کا حکم دیا۔

شریفین آئی تو راشد نے اس سے پوچھا، فضلو کی ماں کو تم نے یقین دلایا ہے کہ اس گھر میں شیطان بسیرا کرتا ہے اور گہنے وغیرہ کی چوری میں اسی کا ہاتھ ہے، کیوں؟''

''میں نے ایک بات کہی تھی سرکار، یقین نہیں دلایا تھا۔''

''لیکن شیطان والی بات تم نے کیسے کہی۔ کیا اس سے پہلے اس قسم کا واقعہ کہیں ہوا ہے؟۔''

''کہاں سنا ہے، میرا مطلب ہے کس سے سنا ہے؟'' راشد نے پوچھا لیکن شریفین خاموش رہی۔

''بولو خاموش کیوں ہو؟'' راشد نے پھر سختی سے پوچھا۔

''لیکن آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' شریفین کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

وجہ ہے تم بتاؤ کس سے سنا ہے؟

''مولوی صاحب نے بتایا تھا۔''

''مولوی کرامت نے بتایا تھا؟''

''جی''

''وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''میرے ہی گھر میں۔''

کیاوہ تمھارے گھر میں رہتے ہیں کب سے تمھارے یہاں ہیں۔

''ابھی ایک مہینہ پہلے وہ اکتاراگڑھ سے یہاں آئے تھے۔''

''تمھاری پہلے سے جان پہچان ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تمھارے یہاں رہنے کی وجہ؟ اور وہ بھی ایک مہینے سے۔''

''جواب دو۔'' راشد کی آواز میں سختی تھی۔

''اکتاراگڑھ میں میری ایک رشتے کی بہن رہتی ہے اسی کا حوالہ دے کر مولوی صاحب میرے یہاں رہ رہے ہیں۔''

راشد پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد اس نے انسپکٹر سے کہا'' آپ جا کر مولوی صاحب کو اپنے ساتھ یہاں لے آیئے۔''

مولوی صاحب جب انسپکٹر کے ساتھ آئے تو ان کی شکل پر بارہ بج رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

راشد نے ایک نظر مولوی صاحب پر ڈالی اور سخت لہجے میں سوال کیا۔''ہاں مولوی صاحب یہ بتایئے کہ آپ نے یہ دھندا کب سے شروع کر رکھا ہے؟'' راشد نے اندھیرے میں ایک تیر پھینکا تھا۔ اتفاق سے یہ تیر نشانے پر بیٹھا اور مولوی صاحب اچھل پڑے انھوں نے غصہ اور نفرت بھری نگاہ شریفین پر ڈالی اور ہکلانے لگے''میں...... میں بے گناہ...... ہوں جناب...... مجھے شریفین نے ہی اکسایا تھا۔''

''جھوٹ بولتے ہوئے مولوی صاحب شرم نہیں آئی'' شریفین چیخی۔

''سرکار یہ مولوی وولوی نہیں، ایک ڈھونگی ہے اکتاراگڑھ میں بھی اس نے شیطانی عمل کا ڈھونگ رچا کر کئی گھروں کو لوٹا ہے۔ یہاں آیا تو دو چار روز میں ہی اس کی مولوی گری کی اصلیہ کھل گئی۔ اس نے مجھ سے سمجھوتا کیا کہ جس جس گھر میں گہنے روپے ہیں وہاں سے لوٹ لیا جائے۔ یہ

آدھا مجھے دیتا اور آدھا خود لیتا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہاں چھ مہینے رہے گا۔ اب یہ ڈھونگی مجھے پھنسانا چاہتا تھا۔ سرکار میں ایک دم بے قصور ہوں۔ فضلو کی ماں سے پوچھیے ہم دونوں پندرہ برس سے ساتھ رہتے ہیں۔''

''اے جھوٹی بول، سندر واور راکھ میں نے چھڑکے تھے؟ ہڈی کا ٹکڑا میں نے رکھا تھا؟ گندے چیتھڑے اس کے گھر میں لے گیا تھا؟ اور گہنے روپے چرا کر اس کے گھر سے میں لایا تھا؟''

''لیکن میں نے یہ سب تیرے ہی اشارے پر کیا تھا۔'' شریفین رونے لگی۔

''خاموش رہ۔'' راشد نے اسے ڈانٹ بتائی۔ پھر اس نے مولوی صاحب سے کہا ''تمھارا کہنا درست بھی ہوسکتا ہے گہنے شریفین نے چرائے تھے۔ لیکن وہ انکار کرسکتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ شریف نے گہنے کہاں رکھے ہیں؟''

''ہاں بتا سکتا ہوں۔ اس نے بھنڈار والے کمرے میں زمین کھود کر اندر دبا دیے ہیں۔''

راشد مسکرانے لگا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر انسپکٹر سے بولا ''انسپکٹر، آپ مولوی صاحب اور شریفین کو گرفتار کرلیں میں فضلو کے ساتھ شریفین کے گھر سے زیور وغیرہ لے کر ابھی آتا ہوں۔''

جب راشد گہنے لے کر واپس آیا تو فضلو کی ماں آنچل پھیلا کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی ''سرکار، آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ لیکن ایک احسان اور کردیں، شریفین کو چھوڑ دیں، وہ بے گناہ ہے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، بہت نیک عورت ہے وہ مولوی صاحب کے بہکاوے میں آگئی۔''

راشد نے انسپکٹر کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر اسے آنکھ سے اشارہ کردیا۔ انسپکٹر بڑبڑایا ''اس بار شریفین کو چھوڑ رہا ہوں۔ حالانکہ اسے مولوی صاحب کے ساتھ جیل میں سڑنا چاہیے۔ آئندہ سے اس نے کوئی غلط حرکت کی تو سیدھے جیل بھیج دوں گا۔ ہاں''

''شکریہ حضور! اب پانچ منٹ کے لیے اور تشریف رکھیں اس غریب کا دل نہ توڑیں چائے پی کر جائیں''، فضلو نے درخواست کی۔ انسپکٹر نے اٹھنا چاہا لیکن راشد نے سرگوشی کی ''غریبوں کا دل رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔''

●●● (ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، اپریل 1971)

نہ بھولنے والی شام

نسیم تیموری

سورج گھنے جنگل کے درختوں، پتیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ آہستہ آہستہ سورج مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ندی کے کنارے کانٹا...... ڈالے بیٹھا تھا۔ اور کبھی کبھی گنگنانے بھی لگتا تھا سورج آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی کانٹا نکال کر کیمپ کی طرف چلا۔ ہمارا ملازم شہباز بیٹھا ابا میاں کا پستول صاف کر رہا تھا۔

ابا میاں اب تک گاؤں سے واپس نہیں آئے تھے۔ وہ ایک ملازم عمر دراز کے ساتھ بہت دیر سے گئے ہوئے تھے۔ لیکن اب تک نہ لوٹے تھے۔ شہباز نے لیمپ روشن کیا اور میرے پاس بیٹھ کر پہاڑی گیت گانے لگا۔ مگر میرا دل اس گیت میں نہ لگا۔ بلکہ اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ ابا میاں کہاں رہ گئے۔ یکایک میرے دل میں خیال گزرا کہ جس شیر کے شکار کو ہم آئے ہیں وہ تو اولاً شکار نہیں ہوا۔ کیا پتہ ابا میاں راستے میں اس سے ٹکرا گئے ہوں یا پھر کہیں ڈاکوؤں وغیرہ نے حملہ نہ کر دیا ہو ورنہ وہ تو اتنی دیر نہ لگا سکتے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو میں بھی سوچتا رہا آخر خیال آیا کہ اگر ابا میاں کسی مصیبت میں گرفتار ہوئے تو میرا اس وقت یہاں بیٹھے رہنا کس کام کا؟ یہ سوچتے ہی میں اٹھا اور شہباز سے پستول مانگا۔ شہباز مجھے بہت دیر تک سمجھاتا رہا۔ مگر میں نہ مانا اور اس سے پستول لے کر چل کھڑا ہوا۔

اس وقت جنگل میں بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جنگل کے درختوں کے سایے سائیں سائیں کر رہے تھے اور میں ہاتھ میں ٹارچ لیے پگڈنڈی پر روشنی ڈالتا چل رہا تھا۔

پتہ نہیں چلتے چلتے کتنا وقت ہو گیا۔ چاند نکل آیا اور جنگل تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ میری ٹانگیں بھی تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ خیال تھا کہ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ مگر اب تو دو گھنٹے گزر گئے اور گاؤں کا پتہ نہ تھا میں اس وقت جنگل کے اس حصے میں سے گذر رہا تھا جو بہت ہی زیادہ گنجان تھا اور پگڈنڈی انتہائی چھوٹی ہو گئی تھی۔ میں اسی راستے پر اندازاً پندرہ منٹ تک چلتا رہا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ حوصلہ بھی بندھا تھا کیونکہ میرا پستول میرے پاس تھا، جس کی سات گولیوں پر مجھے اعتماد تھا کہ میری جان بچا لیں گی۔

چاند کی شعاعیں درختوں میں سے چھن چھن کر مجھ پر گر رہی تھیں۔ کبھی کبھی پاس ہی سے پرندے نکل کر اڑتے اور میں پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیتا۔

یکا یک چلتے چلتے اتنے گھنے جنگل سے ایک میدان میں نکل آیا جو چاروں طرف گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس وقت چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو چکے تھے اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس جگہ پر آرام کروں اور میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سہارے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا اور پستول نکال کر سامنے رکھ لیا۔

اس وقت اس جگہ کا سماں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چاروں طرف چاندنی نے کھیت کیا ہوا تھا۔ مگر کبھی کبھی مجھے بہت زیادہ ڈر لگنے لگتا کیونکہ آس پاس کی جھاڑیوں سے بڑے بڑے پرندے کھڑ کھڑ کرتے اڑ جاتے اور میں اسی طرف دیکھنے لگتا۔

یکا یک میرے پیچھے بڑے زور کی کھڑ کھڑاہٹ ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی غراہٹ کی بھی آواز آئی۔ میرے کان چوکنے ہو گئے اور میں نے اسی طرف پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے جھاڑیوں میں کوئی بھوری سی چیز پھر رہی تھی جس کے پیروں کے نیچے سوکھے پتے کھڑ کھڑا رہے تھے یکا یک میرے دل میں خیال گزرا کہ کہیں کوئی خوفناک درندہ نہ ہو اور اس خیال کے آتے ہی میں چپکے چپکے اپنی جگہ سے رینگا اور پستول ہاتھ میں لیے پاس ہی ایک درخت پر پہنچا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھنا شروع کیا ابھی میں پہلی ہی شاخ پر پہنچا تھا کہ یکا یک ہی جھاڑیوں میں سے ایک بہت ہی لمبا سا جانور کوئی چیز گھسیٹتا ہوا نکلا اور میدان میں لا کر اسے کھانے لگا۔ مارے خوف کے میں آنکھیں بند کر لیں کیونکہ یہی کمبخت وہ شیر تھا جسے ہم گاؤں والوں کی درخواست پر مارنے کے لیے آئے تھے مگر اب تک اس کا نشان نہ ملا تھا آج یکا یک اس وقت مجھے مل گیا۔ دوسرے لمحے میں نے اپنے حواس

درست کیے اور درخت کے اوپر آہستہ آہستہ چڑھنا شروع کیا۔ پستول میں نے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ میں درخت کے آخری حصے پر پہنچ گیا اور ایک موٹی سی شاخ پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔

اس وقت میرے دل میں خیال گزرا کہ کیوں نہ اسے پستول سے نشانہ بنا دوں اور اس کے آتے ہی میری ہمت بندھ گئی۔ میں شاخ کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے اس کے سر کا نشانہ لے کر پستول داغ دیا مگر افسوس کہ نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا اور خطا ہوگا۔ شیر تڑپ کر اچھلا اور دہاڑنے لگا گویا دشمن کو سامنے آنے کا چیلنج دے رہا ہو مگر اس مردم خور شیر کے سامنے جانے کی کون ہمت کر سکتا تھا۔ میں نے پھر اپنے حواس بجا کیے اور پوری توجہ کے ساتھ نشانہ لے کر دو اور فائر کر دیے۔ گولیاں جنگل کے بادشاہ کے پچھلے دھڑ کو چھیدتی چلی گئیں اس نے بڑے زور سے جست لگائی لیکن چند قدم کے فاصلہ پر جا گرا۔ میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سمایا لیکن ابھی تک اس کے صحیح نشانہ نہ بیٹھا تھا اس لیے آہستہ آہستہ آگے کھسک کر نشانہ لیا اور جلد ہی فائر داغ دیا۔ مگر افسوس جلدی میں خیال نہ رہا تھا کہ شاخ آگے سے کمزور ہے اور فائر کے ساتھ ہی میں بھی بیس فٹ کی بلندی سے لڑھک کر نیچے آگرا۔ مگر شکر ہے کہ کروٹ کے بل گرا پستول مجھ سے تھوڑی دور جا پڑا تھا۔ آدم خور نے مجھے گرتے دیکھا اور اپنے دشمن کی طرف گھسٹتا گھسٹتا آگے بڑھا۔ ایک تو چوٹ کی تکلیف اور دوسرے یہ آدم خور، میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ میں نے آخری مرتبہ پوری ہمت کر کے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پستول کو کانپتے ہاتھوں سے پکڑ کر آخری مرتبہ داغ دیا۔ گولی کے ساتھ ہی ساتھ شیر کی چیخ نکلی اور میرے کانوں میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو کیمپ میں لیٹا تھا ابا میاں پاس بیٹھے سکائی کر رہے تھے معلوم ہوا کہ میرے جاتے ہی ابا میاں گاؤں سے واپس آئے مگر پتہ چلا کہ میں ان کی تلاش میں گیا ہوں اس لیے مجھے ڈھونڈنے نکلے اور تین گھنٹے کے بعد اس میدان میں مردہ آدم خور کے پاس بیہوش پایا اور اٹھا کر لے آئے۔

اچھا ہونے پر گاؤں والوں نے مجھے اچھے اچھے تحفے دیے اور کندھوں پر اٹھا کر سارے گاؤں میں گھمایا۔ ابا میاں نے بھی ایک چھوٹی رائفل خوش ہو کر انعام میں دی اور اس مردم خور شیر کی کھال آج بھی میرے کمرے کی دیوار پر آویزاں ہے۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، مئی 1974)

●●●

کھلونا

بھالو کی دم

شکیل انوار صدیقی

بچوں کو بھالو بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ بھالو جیسے بھاری بھرکم جانور کی دم اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہے؟ دراصل پہلے بھالو کی دم کافی لمبی ہوتی تھی۔ پھر یہ چھوٹی کیسے ہوگئی؟ اس کا بڑا دلچسپ قصہ ہے۔

ایک دن بہت سردی پڑ رہی تھی۔ ایک آدمی ایک ٹھیلے پر مچھلیاں لادے جا رہا تھا۔ جب وہ لومڑی کے گھر کے سامنے سے گزرا تو مچھلیوں کو دیکھ کر لومڑی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ چھلانگ مار کر ٹھیلے پر چڑھ گئی اور اس ٹھیلے پر سے اچھی اچھی مچھلیاں چن کر نیچے پھینکنا شروع کر دیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اب مچھلیاں کافی جمع ہوگئیں تو وہ نیچے کود گئی۔

ابھی لومڑی نے پہلی مچھلی ہی کھانا شروع کی تھی کہ ادھر سے ایک بھالو آ گیا۔ اس نے جب اتنی مچھلیاں دیکھیں تو اس کی بھی رال ٹپکنے لگی۔ اس نے لومڑی سے کہا۔ ”تم بہت قسمت والی ہو جو تم کو مچھلیاں ملیں۔ یہ مچھلیاں بہت اچھی ہیں۔ تم نے انھیں کہاں سے پکڑا؟“

لومڑی بہت چالاک تھی۔ اس کے دماغ میں فوراً بھالو کو جل دینے کی ایک ترکیب آ گئی اور وہ مکاری سے مسکرانے لگی۔ اس نے کہا ”ہاں یہ مچھلیاں بہت اچھی ہیں۔ اگر آج رات کو تم میرے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلو تو میں تم کو ان سے بھی اچھی مچھلیاں پکڑنا سکھا دوں گی۔“

بھالو بہت خوش ہوا اور بولا ”میں خوشی خوشی تمھارے ساتھ چلوں گا۔ میں اپنے ساتھ مچھلی

پکڑنے کا کانٹا اور ڈور بھی لے چلوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرنا۔"

لومڑی نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے ڈور کانٹے کی ضرورت نہیں۔ میں تو مچھلیاں اپنی دم سے پکڑتی ہوں۔ تمھاری دم تو اور بھی لمبی ہے۔ تم تو مجھ سے زیادہ مچھلیاں پکڑ سکتے ہو۔"

شام کو لومڑی اور بھالو ساتھ ساتھ چلے۔ آگے آگے لومڑی اور پیچھے پیچھے بھالو۔ ندی میں ہر طرف برف جمی ہوئی تھی۔ لومڑی نے بہت گھوم پھر کر ایک گڑھا تلاش کر لیا۔ اس کے چاروں طرف برف جمی تھی۔ پانی کی اوپری سطح پر بھی برف جمنا شروع ہو چکی تھی۔ لومڑی نے بھالو سے کہا "تم اس گڑھے کے کنارے پر برف پر بیٹھ جاؤ اور اپنی دم پانی میں لٹکا دو۔ تم کو کافی وقت تک یہاں بیٹھنا پڑے گا۔ یہی مچھلی پکڑنے کا سب سے اچھا ڈھنگ ہے۔ تم یہاں اس وقت تک بیٹھے رہنا جب تک بہت سی مچھلیاں تمھاری دم میں نہ لپٹ جائیں۔ جب کافی مچھلیاں تمھاری دم کو جکڑ لیں تو اپنی پوری طاقت سے دم کو باہر نکال لینا۔"

بھالو اس جگہ کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ سردی بڑھتی گئی اور وہ تھر تھر کانپنے لگا اس نے چلا کر کہا "بی لومڑی! کیا میں اب بھی دم کو مچھلیوں سمیت باہر نہیں کھینچ سکتا۔"

"نہیں، ابھی نہیں۔" لومڑی نے کہا "جب تک تمھاری دم پر اور مچھلیاں لپٹ نہ جائیں تم اسی طرح بیٹھے رہو۔ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو، اس لیے زیادہ دیر تک اپنی دم ٹھنڈے پانی میں رکھ سکتے ہو۔

صبح ہونے تک بے چارہ بھالو اپنی دم کو پانی میں ڈالے رہا۔ پانی اب برف بن چکا تھا اور بھالو کی دم برف نے بری طرح جکڑ لی تھی۔ لومڑی نے اس سے کہا "اب تمھاری دم سے کافی مچھلیاں لپٹ گئی ہوں گی۔ تم اپنی دم گڑھے سے نکال لو اور مزے سے مچھلیاں کھاؤ میں چلتی ہوں۔"

بھالو نے اپنی دم گڑھے سے نکالنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس نے سوچا، شاید بہت زیادہ مچھلیاں دم سے لپٹ گئی ہیں۔ اس نے پوری طاقت سے جھٹکا دیا تو دم باہر نکل گئی۔ دم ٹوٹ گئی تھی اور بہت چھوٹی سی رہ گئی تھی۔

اس دن سے بھالو کی دم چھوٹی ہی رہ گئی ہے۔

(جرمن لوک کتھا۔ ماہنامہ، "کھلونا"، نئی دہلی 1974)

●●●

راز کی بات

سمیع الاسلام

میں پچھلے ایک ماہ سے اتنا مصروف تھا کہ ایڈیٹر کے مسلسل کئی خط آنے کے باوجود ابھی تک سالنامے کے لیے کہانی نہ بھیج سکا تھا۔ آج اتوار کا دن تھا لہٰذا یہ طے کیا، آج کہانی بھیج کر ہی دم لیں گے اس لیے قلم کاغذ اٹھا کر بیٹھ گیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

''پروین ایک بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کے پاس ایک بلی تھی اس کا نام اس نے بیلا رکھا تھا۔ اس کو وہ.........'' اتنے، کھیلتے ہوئے شمی نے پکارا۔ ''پاپا۔ پاپا۔'' اور کہانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''بیٹا کھیلو۔ ابھی سنتا ہوں'' میں نے چمکارتے ہوئے کہا۔

''کان میں ایک بات کہیں گے'' شمی نے گھوڑے سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ تو ابھی تم گھوڑے سے کہہ دو۔ پھر ہم سے کہنا'' میں نے ٹالتے ہوئے کہا اور پھر لکھنے لگا۔

''بہت چاہتی تھی اس کو دودھ پلاتی تھی اور روزانہ صابن سے نہلاتی تھی'' اتنا لکھا تھا کہ شمی نے پکارا۔

''پاپا۔ اب آئیں کان میں بات کہنے؟''

''گھوڑے سے کہہ دیا؟'' میں نے پوچھا؟

''جی ہاں اس سے کہہ دیا'' شمی بولا۔

''اچھا تو اب تم توتے سے کہہ دو۔ پھر ہم سے کہنا''

میں نے سوچا اس طرح اس میں لگا رہے گا تو تھوڑا موقع لکھنے کو اور مل جائے گا۔

اب پھر میں نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا دو لائن مشکل سے لکھنے پایا تھا کہ شمی نے پھر میری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور زبان پر وہی سوال "پاپا آپ کے کان میں ایک بات کہیں گے۔"

مجھے اس کی بھولی باتیں اس وقت ناگوار معلوم ہو رہی تھیں مگر اس کی دل شکنی کا خیال کرتے ہوئے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ اب کہو"

"آپ کسی سے کہیے گا تو نہیں" شمی نے کرسی پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو کان لائیے ہمارے منہ کے پاس" شمی بولا

میں کرسی سے نیچے اتر گیا۔ میرے کان کے پاس منہ رکھ کر کچھ کہنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا اور چپکے چپکے کہنے لگا۔

"پاپا۔ ہم آپ سے بہت۔ بہت۔ محبت کرتے ہیں"۔ "تو یہ تھی راز کی بات جس کو کان میں کہنا چاہتا تھا تا کہ کوئی دوسرا نہ سن لے" میں دل میں کہنے لگا اور دونوں ہاتھوں سے گود میں لے کر پیار کرنے لگا۔ اور کہانی پھر نہ بھیج سکا۔

(ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی)

●●●

ڈاکٹر اور مریض

خلیق انجم اشرفی

ایک شخص بھاگا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور بولا ''ڈاکٹر صاحب جلدی چلیے میرے بچے نے سوئی کھالی ہے۔''

''میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے سرد مہری سے جواب دیا ''کیوں۔''

''تم خود ہی سوچو'' ڈاکٹر کہنے لگا۔ ایک پیسے کی سوئی کے لیے تم اتنی دوڑ دھوپ کر رہے ہو۔ تو میری پندرہ روپے فیس کیسے ادا کرو گے۔

دو ڈاکٹروں نے ایک ہی مریض کا معائنہ کیا اور ساتھ کے کمرے میں بیٹھ کر اس کیس پر تبادلۂ خیال کرنے لگے لیکن بدقسمتی سے انھیں دروازہ بند کرنے کا خیال نہ رہا اور وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔

''تمھارا خیال بالکل غلط ہے۔'' پہلے ڈاکٹر نے کہا۔

''بالکل نہیں! میری تشخیص بالکل درست ہے۔ دوسرے نے جواب دیا۔

ان کی آپس میں گرما گرمی سن کر مریض کھانسنے لگا اور انھوں نے کیس کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے معاملہ وہیں ختم کر دیا لیکن پہلا ڈاکٹر اس کمرے سے جاتے ہوئے کہنے لگا۔'' آپ اس وقت جو کہیں درست ہے۔ لیکن جب مریض کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جائے گا تو میری بات بالکل

درست ثابت ہوگی۔

ایک دفعہ ایک لڑکا بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا ڈاکٹر صاحب مجھے جلدی سے بیہوشی کی دوا دیجیے۔"
ڈاکٹر نے فوراً لڑکے کو دوائی سنگھا کر بیہوش کر دیا جب تھوڑی دیر کے بعد لڑکے کو ہوش آیا تو بولا۔" ڈاکٹر صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا بیہوشی کی دوا کی تو میرے پڑوسی کو ضرورت تھی میں تو دوا لینے آیا تھا۔

"ایک بوڑھا ڈاکٹر کسی سے کہہ رہا تھا۔" میری دوائی ....ا جی میری دوائی کا اثر تو پانچ منٹ میں ہوتا ہے۔"
دوسرے نے جواب دیا۔" اسی لیے تو ایک آدمی نے آپ کی دکان کے پاس کفن کی دکان کھول رکھی ہے۔"

سیٹھ جی کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی فوراً ڈاکٹر کو بلایا، ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد دریافت کیا۔" آپ نے صبح اور دوپہر کو کیا کھایا تھا۔کوئی خاص ناقص چیز تو نہیں کھائی تھی۔" سیٹھ نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔" صبح چائے کے ساتھ انڈے اور دوپہر کو مرغی کے ساتھ روٹی تھی"۔" اب اصلی مرض کا پتہ چل گیا۔" ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا۔
"کیا؟"

"بات دراصل یہ ہے"۔ڈاکٹر نے وضاحت کی۔" صبح آپ نے انڈے کھائے اور دوپہر کو مرغی میرے خیال میں مرغی اندر جا کر انڈوں پر بیٹھ گئی ہوگی۔جس کی وجہ سے گڑبڑ ہونا لازمی تھا۔"

ایک ڈاکٹر صاحب بہت پیٹو تھے ایک بار ان کے دوستوں نے روٹی کھانے کی شرط لگائی جسے ڈاکٹر صاحب نے بخوشی منظور کر لیا۔شام کو سب دوستوں نے ہوٹل میں جا کر کھانا شروع کیا۔ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے......لیکن ڈاکٹر صاحب بس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔لمحہ بہ لمحہ ان کی توند پھولتی جا رہی تھی دوستوں کو فکر ہوئی کہ کہیں پیٹ ہی پھٹ گیا تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ انھوں نے ہار مان لی اور تب جا کر ڈاکٹر صاحب نے بس کی۔شرط کے روپے لینے کے بعد انھوں نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔" بھئی اب میری بھی ایک شرط ہے۔"" وہ کیا۔" سب نے بیک

زبان ہو کر پوچھا۔

''وہ یہ کہ میری بیوی سے جا کر کوئی یہ نہ کہے کہ شام کو ہوٹل سے کھانا کھا کر آیا ہوں ورنہ وہ مجھے رات کو کھانا نہیں دے گی اور مجھے بھوکا سونا پڑے گا۔

ایک ڈاکٹر صاحب کو انسپکٹر جنرل آف پولیس نے فون کیا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں پہنچ جائیں۔ میرا لڑکا چھت سے گر پڑا ہے۔

یہ سنتے ہی ڈاکٹر کے توتے اڑ گئے جلدی جلدی بیگ میں سامان ڈال کر بجائے سائیکل پر چڑھنے کے ساتھ لے کر بھاگنا شروع کر دیا راستے میں ایک واقف کار نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر اتنی جلدی ہے تو سائیکل پر چڑھ جایئے۔'' بھاگتے ہوئے ڈاکٹر نے جواب دیا۔'' ارے بھئی پانچ منٹ میں پہنچنا ہے اتنا وقت کہاں ہے کہ سائیکل پر چڑھ سکوں۔''

دوا پلانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب مریض سے کہنے لگے'' بھئی! دوائی کے پہلے پیسے ادا کر دو۔

''کیوں؟'' مریض نے پوچھا، کیا کوئی خاص بات ہے؟

''ہاں۔'' ڈاکٹر بولا۔'' کل یہ دوائی پیتے ہی ایک مریض مر گیا اور میرے پیسے مارے گئے۔''

تقریباً دو ماہ علاج کرانے کے بعد جب مریض ٹھیک ہو گیا تو کہنے لگا'' ڈاکٹر صاحب! اب میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں بس ایک ایسی دوا دیں کہ میرے جسم میں گرمی پیدا ہو جائے۔''

''اس لیے دوائی کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''جب میں دو ماہ کا بل پیش کروں گا تو اپنے آپ ہی گرمی پیدا ہو جائے گی۔''

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، 1974)

●●●

ہم فیل ہو گئے

پروانہ ردولوی

دشمن خوشی منائیں کہ ہم فیل ہو گئے
دعوت ہمیں کھلائیں کہ ہم فیل ہو گئے

کیوں بھیڑ دوستوں کی لگی ہے مرے قریب
سب لوگ بھاگ جائیں کہ ہم فیل ہو گئے

احباب کھیل کود میں رہتے تھے جو شریک
وہ پاس اب نہ آئیں کہ ہم فیل ہو گئے

ہر بار پاس ہونے میں آتا نہ تھا مزہ
"امی نہ تاؤ کھائیں" کہ ہم فیل ہو گئے

بزدل نہیں ہیں ہم کہ کریں آہ و زاریاں
"ابو نہ غم منائیں!" کہ ہم فیل ہو گئے

جو پاس ہو گئے ہیں وہ سب لوگ آج ہی
لڈو ہمیں کھلائیں کہ ہم فیل ہو گئے

جو لوگ فیل ہیں وہ کریں اک مظاہرہ
نعرہ یہی لگائیں کہ ہم فیل ہو گئے

روتے ہیں شیر دل کہیں مشکل کے وقت میں
سب قہقہے لگائیں کہ ہم فیل ہو گئے

●●●

شرارت کا مزہ

ڈاکٹر محمد شفیع الدین نیر

رشیدہ تھی یوں تو بڑی نیک لڑکی
مگر اس میں یہ ایک عادت بری تھی
وہ ہر چیز کو چھوتی اور چھیڑتی تھی
یہ بات اس کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
برائی ہو اک بھی تو کیسی بری ہے
بھلائی کی رگ کاٹنے کو چھری ہے
کبھی چائے دانی کا ڈھکنا اٹھاتی
وہ یہ جھانک کر دیکھتی اس میں کیا ہے
کبھی کیتلی کو الٹ کر گراتی
سمجھتی جو دھیان آپ کا بٹ گیا ہے
اسے روکتے بھی تو رکتی وہ کب تھی
بری اس میں عادت پڑی یہ عجب تھی
یہ اک دن کا ہے ذکر قصہ ہوا کیا
تپائی پہ دادی نے عینک کو رکھا

تھی نسوار کی بھی وہیں ایک ڈبیا
رشیدہ نے ان دونوں چیزوں کو تاکا
یہ سوچا کہ دیکھوں گی چیزیں یہ کیا ہیں
ذرا دادی اماں ہٹیں یاں سے جائیں
غرض ان کے ہٹتے ہی بن اس کی آئی
اسی وقت آنکھوں پہ عینک لگائی
وہ ڈبیا بھی نسوار کی اس کو بھائی
کہ رنگین ڈھکنے میں تھی خوش نمائی
وہ عینک تو پہلے لگا ہی چکی تھی
ہوئی فکر ڈبیا کو اب کھولنے کی
کہا دل میں، مجھ سے کہیں گی یہ دادی
کہ بیٹی! نہ چھونا اسے بھول کر بھی
مگر شکر ہے اس گھڑی وہ نہیں ہیں
نہ ابا، نہ اماں نہ آپا کہیں ہیں
ذرا کھول کر دیکھ لوں اس میں کیا ہے
ابھی بند کردوں گی پھر ہرج کیا ہے
رشیدہ نے ڈبیا کا ڈھکنا جو کھولا
تو اس میں لگا زور کا ایک جھٹکا
ہوا میں وہ نسوار ہر سمت پھیلی
رشیدہ کے چہرے پہ اڑ اڑ کے آئی
نہ آنکھیں، نہ نتھنے، نہ منہ اور نہ تھوڑی
جگہ ایک بھی اس نے باقی نہ چھوڑی
ہوئی ناک نسوار سے اس کی لت پت

نہ پوچھو بنی اس گھڑی اس کی کیا گت
وہ گھبرا کے ہر ہر طرف خوب دوڑی
مگر پھر بھی چھینکوں سے فرصت نہ پائی
نہ آرام اس کو ملا ایک پل بھی
نہ مل پائی اس کو ذرا دیر کل بھی
وہ گھبرائی اتنی کہ عینک کو پھینکا
چلی پھر وہ پانی سے دھونے کو چہرا
نہایت ہی نازک تھے عینک کے شیشے
وہ گرتے ہی بس ہوگئے ٹکڑے ٹکڑے
ملی اس کو اپنے کیے کی سزا یہ
کہ ملتی ہے پھوٹے ہوئے کی سزا یہ
پھر اتنے میں دادی کو آتے جو دیکھا
ہوا حال ابتر بہت پھر تو اس کا
''رشیدہ! اری تجھ کو یہ ہوگیا کیا؟''
یہ دادی نے تیوری چڑھا کر جو پوچھا
تو بس شرم سے گڑ گئیں بی رشیدہ
عجب سوچ میں پڑ گئیں بی رشیدہ
رشیدہ کی حالت ہوئی غیر دکھ سے
رہا کام اس کو خوشی سے نہ سکھ سے
کیا اس نے وعدہ یہ کھا کھا کے قسمیں
کہ اب بھول کر بھی نہ چھیڑوں گی چیزیں
سنا ہے یہ نیر نے لوگوں کا کہنا
رشیدہ نے وعدہ کیا اپنا پورا

●●●

امتحان کی کامیابی

کیف احمد صدیقی

نتیجہ سن کے کئی لوگ بدحواس ہوئے
خدا کا شکر کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے
صلہ ملا ہے ہمیں سال بھر کی محنت کا
چمک رہا ہے ستارہ ہماری قسمت کیا
یہی تو وقت ملا ہے ہمیں مسرت کا
جو فیل ہو گئے وہ اس قدر اداس ہوئے
خدا کا شکر ہے ہم امتحاں میں پاس ہوئے
وہ امتحان میں راتوں کو جاگ کر پڑھنا
وہ نیند آنکھ میں چھائی ہوئی مگر پڑھنا
وہ آدھی رات سے بستر پہ تا سحر پڑھنا
زہے نصیب وہ لمحات ہم کو راس ہوئے
خدا کا شکر ہے ہم امتحاں میں پاس ہوئے
جنھیں تھا اپنی لیاقت پہ اعتبار بہت
جنھیں خود اپنے قلم پر تھا اختیار بہت

جو اپنے آپ کو سمجھے تھے ہوشیار بہت
انھیں کے ہوش اڑے اور گم حواس ہوئے
خدا کا شکر ہے ہم امتحاں میں پاس ہوئے

●●●

علم

ساجد صدیقی لکھنوی

علم سے اپنی شان ہے یارو
علم سے اپنی آن ہے یارو
علم سے عزتِ وطن بھی ہے
علم سے حرمتِ چمن بھی ہے
علم حاصل ہے زندگانی کا
علم حاصل ہے کامرانی کا
علم اک شجر ہے محبت کا
علم اک دیش ہے صداقت کا
علم اک پرچمِ وفا بھی ہے
علم آئینۂ حیا بھی ہے
علم سے روشنی ملی ہم کو
علم سے زندگی ملی ہم کو
علم سے اپنا بول بالا ہے
ساری دنیا میں جو اُجالا ہے
علم سے تیرگی کو دور کرو
کام اچھا ہے تم ضرور کرو
یہ بڑوں کا ادب سکھاتا ہے
پیار کرنا ہمیں بتاتا ہے
پڑھنے لکھنے سے گھر کی زینت ہے
اور اسی سے ہماری عزت ہے
ہر برائی سے یہ بچاتا ہے
نیک راہ پر ہمیں چلاتا ہے
نیک لوگوں سے یہ ملاتا ہے
جو ہیں بچھڑے گلے لگاتا ہے
جو پڑھائی سے دل چرائیں گے
وہ بدی پر ہمیں چلائیں گے
علم کی روشنی دکھاؤ انہیں
علم کیا چیز ہے بتاؤ انہیں

آؤ مل جل کے ہم پڑھیں یارو
سیدھے رستے پہ ہم چلیں یارو

سلام مچھلی شہری
اسکول کھل گئے ہیں

اسکول کھل گئے ہیں

سلام مچھلی شہری

پھر آگیا ہماری تعلیم کا زمانہ
اسکول میں چھڑے گا، پھر شوق کا ترانہ
سوجھا کرے گا ہم کو پھر روز ایک بہانہ
خالی رہا کرے گا اکثر کتاب خانہ
سمجھا کریں گے ہم کو سب ماسٹر دوانہ
پھر آگیا ہماری تعلیم کا زمانہ
دو ماہ میں یہاں کے نقشے بدل گئے ہیں
جو حال ہے، اسی میں، سب دوست کھو گئے ہیں
کچھ فیل ہو گئے ہیں کچھ پاس ہو گئے ہیں
اپنے لیے تو سب ہی موتی پرو گئے ہیں
ہم وقت کے سنہرے سانچے میں ڈھل گئے ہیں
دو ماہ میں یہاں کے نقشے بدل گئے ہیں
غرضیکہ پھر ہمارے اسکول کھل گئے ہیں

اور ہم نئی فضا میں مسرور ہو رہے ہیں
تازہ تریں ہوا میں مسرور ہو رہے ہیں
امید کی فضا میں مسرور ہو رہے ہیں
زنجیرِ غم سے گویا سب پھول کھل گئے ہیں
غرضیکہ پھر ہمارے اسکول کھل گئے ہیں

●●●

ہمارا اسکول

رئیس امروہوی

اپنے اسکول کے پیارے ہم ہیں
اور اسکول ہے پیارا ہم کو
کیوں نہ جینے کا سہارا کہئے
ہے یہ جینے کا سہارا ہم کو
کتنا پیارا ہے یہ پیارا اسکول
پیارا پیارا ہے ہمارا اسکول

شام کو کھیل۔ پڑھائی دن بھر
دن میں اسکول ہے رات میں گھر
سارے ساتھی ہیں یہاں پر اپنے
کیوں یہ اسکول ہو ہم کو دوبھر
ہم سے قائم ہے ہمارا اسکول
پیارا پیارا ہے ہمارا اسکول

جو نہیں دوسرے اسکولوں میں
اپنے اسکول میں وہ شان بھی ہے
کیوں یہاں جی نہ ہمارا بہلے
کہ یہاں کھیل کا میدان بھی ہے
اپنی آنکھوں کا ستارا اسکول
پیارا پیارا ہے یہ پیارا اسکول
پیارا پیارا ہے ہمارا اسکول

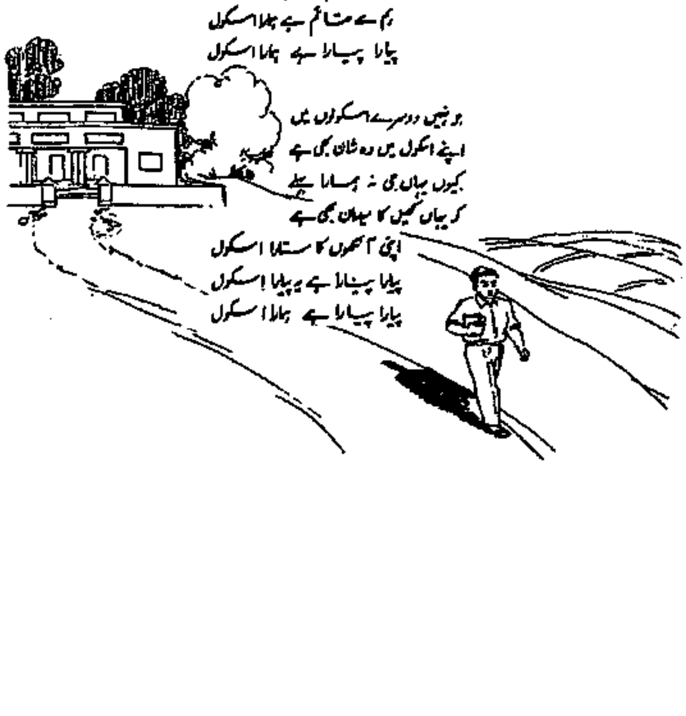

روشنی کی واپسی

قدیر جاوید پریمی

''ایک مجسٹریٹ کا لڑکا اور چور!'' خلیل احمد خاں مجسٹریٹ نے دل میں سوچا' اے خدا کیا اسی دن کے لیے تو نے مجھے بیٹا دیا تھا..........'' سوچتے سوچتے وہ پریشان ہو گئے ان کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے لرزنے لگے اور دل میں اندیشے اور وسوسے کلبلانے لگے۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے وہ نڈھال سے دکھائی دے رہے تھے۔ جو شخص دل کا اتنا مضبوط ہو کہ آئے دن مجرموں کے لیے سخت سے سخت سزائیں اور جرمانے دم بھر میں لکھ دیتا ہو، آج وہی ایک کمزور سے لڑکے کے آگے بے بس تھا۔ اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اپنے دل کے ٹکڑے کے خلاف فیصلہ سنائے اور اسے سزا دے۔ ایسی کمزوری اور بے بسی آخر کیوں تھی؟ اس لیے کہ یہ فیصلہ ان کے منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے اکلوتے فرزند کے خلاف ہونا تھا۔ یہ فیصلہ اپنے ہی خون کے خلاف ہونا تھا۔ مگر خون پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مجھے نہ للکارو، مجھے سزا دو......اور وہ لاچار سے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سوچ میں غرق تھے۔

یوں تو شکیل میں کوئی عیب، کوئی برائی نہ تھی۔ مگر ادھر پچھلے ایک ماہ سے وہ والدین کے پیسوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔ جب دیکھو، جیب میں سے روپے غائب۔ جب سنومی کے پرس میں

سے ریزگاری ندارد۔ شروع شروع میں ملازموں پر شبہ ہوا۔ کئی ملازم مجسٹریٹ صاحب کی خونخوار نظروں کا شکار ہوئے۔ دو تین کے طمانچے بھی پڑے۔ لیکن جرم کوئی بھی ثابت نہ ہوا۔ آخر ایک روز مجسٹریٹ صاحب نے چور خود پکڑ لیا۔ عین وقت پر انھیں چور پکڑتے ہوئے ایک ملازم نے بھی دیکھ لیا۔ یہ ملازم وہ لڑکا تھا جو پیسے غائب ہونے کے سلسلے میں مار کھا چکا تھا۔ ایک تو بیٹے کے چور ہونے کا غم، دوسرے بیٹے کی چوری ملازم کے سامنے پکڑے جانے کا افسوس، ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس ملازم کا منہ کیسے بند کریں۔ رشوت کے وہ بے حد خلاف تھے، لہٰذا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس ملازم کو نکالتے تو بھی بدنامی سے بچنا محال تھا۔ بدنامی کے خوف اور بیٹے کے بدکردار ہونے کے خیال سے وہ لرز اٹھے۔

پھر لاکھ احتیاط کے باوجود یہ برائی دور نہ ہوئی۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ ہاتھ صاف کر دیتا۔ ادھر مجسٹریٹ صاحب نے کپڑے تبدیل کیے، ادھر جیب سے کچھ رقم غائب ادھر ممی شاپنگ کر کے گھر واپس آئیں۔ سامان اپنی جگہ رکھا اور واپس کمرے میں آ کر پرس دیکھا تو رقم میں سے تھوڑی بہت صاف ہو چکی تھی۔ ایک عجیب گتھی تھی جو کسی طرح سلجھتی ہی نہ تھی۔ مجسٹریٹ صاحب نے دو ایک بار تنہائی میں بیٹے کو سخت وسست بھی کہا، بلکہ دو تین بار طمانچے بھی جڑ دیے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

گھر میں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ موجود تھا۔ پہننے کے لیے ایک سے ایک عمدہ اور قیمتی پوشاکیں، کھانے پینے کے لیے لذیذ ترین کھانے، خدمت کے لیے کئی ملازم — مجسٹریٹ صاحب کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ پھر بھی شکیل چوری کیوں کرتا ہے۔ کہتے ہیں چوری وہی کرتا ہے جس کا پیٹ خالی ہو، تن ننگا ہو۔ مگر یہاں تو نہ پیٹ خالی تھا اور نہ تن ننگا تھا۔ پھر چوری کی وجہ؟ مگر وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مار پیٹ سے بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو مجسٹریٹ صاحب نے بیٹے کو سدھارنے کے لیے کوئی دوسری ترکیب سوچنا شروع کی — ایسی ترکیب جس سے سانپ بھی مر جائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ہفتے کا دن تھا۔ ہفتے کو کورٹ کا وقت آدھے دن تک رہتا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب ایک بجے گھر آ گئے تھے گھر میں شکیل کو چھوڑ کر سب لوگ موجود تھے۔ مجسٹریٹ صاحب کپڑے تبدیل کر کے اپنے کمرے میں مسہری پر دراز ہو گئے۔ چند منٹ تک اخبار پڑھا پھر شکیل کے نام آیا ہوا بچوں کا ایک رسالہ کھول کر دیکھنے لگے۔ شروع کی دو تین کہانیاں اور نظمیں پڑھنے کے بعد جب انھوں نے چوتھی

کہانی پڑھی تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ ان کا مرجھایا ہوا چہرہ کسی اندرونی مسرت سے چمک اٹھا۔ اس کہانی نے ان کی ایک بڑی پریشانی حل کر دی تھی۔ جو ترکیب وہ مہینہ بھر میں بھی نہ سوچ سکے تھے، وہ اس کہانی نے منٹوں میں بتا دی تھی۔ دل ہی دل میں انھوں نے اس کہانی کی مصنفہ کو مبارک باد دی، شکریہ ادا کیا، اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھے اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچ کر انھیں کہانی والی ترکیب کے بارے میں بتایا۔ جب انھیں اپنا ہم خیال بنا لیا تو دو تین خاص پرانے ملازموں کو راز دار بنالیا اور اس طرح تیاری مکمل کر کے وہ شکیل کی واپسی کی راہ دیکھنے لگے۔

شکیل نے گھر میں قدم رکھا تو ایک عجیب طرح کی خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ اسکول کی ڈریس بدل کر وہ باہر نکلا تو سامنے سے گھر کا بوڑھا ملازم غفور آتا دکھائی دیا۔ شکیل نے دیکھا اس کے ہاتھوں میں کچھ دواؤں کی شیشیاں تھیں۔

"ارے غفور، یہ دوائیں کس کے لیے لے جا رہے ہو؟"

"صاحب کے لیے۔" غفور نے مختصر جواب دیا اور سیدھا صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ شکیل بڑا پریشان ہوا اور تیزی سے مجسٹریٹ صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ مسہری پر اس کے والد کروٹ لیے لیٹے تھے۔ سرہانے اس کی ممی خاموش سی بیٹھی تھیں۔ غفور میز پر دواؤں کی شیشیاں رکھ رہا تھا۔

"ممی"، شکیل نے دھیمی آواز میں والدہ کو مخاطب کیا۔

"شی......ای......" ممی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے کچھ نہ بولا۔ اس کا دل از خود گھبرانے لگا۔ کمرے کا بوجھل ماحول اس کے دل پر چھا گیا۔ گھبرا کر وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا اشارہ پا کر غفور بھی اس کے ساتھ نکلا۔

"آخر ڈیڈی کی طبیعت ایسی کیا خراب ہے جو سب لوگ اس طرح خاموش ہیں؟"

میاں بات دراصل یہ ہے کہ کسی شخص سے صاحب نے آج رشوت لی تھی۔۔۔"

"رشوت؟" غفور کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ بول پڑا۔ "لیکن ڈیڈی تو رشوت کے بالکل خلاف ہیں۔"

"یہی تو تعجب کی بات ہے!" غفور نے آگے بتایا، "پھر بھی انھوں نے رشوت لی جس کا نتیجہ یہ نکلا...... کہ ان کی آنکھیں...... آنکھیں......" کہتے کہتے غفور کا گلا رندھ گیا اور بات ادھوری رہ گئی۔

شکیل آنکھوں کا نام سن کر تڑپ اٹھا۔ گھبرا کر غفور سے بولا۔ "کیا ہوا ڈیڈی کی آنکھوں کو؟"

''ان کی روشنی چلی گئی۔'' غفور نے سسکی لے کر کہا اور شانے پر پڑے ہوئے انگوچھے سے بھیگی پلکیں پونچھنے لگا۔

''نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا ڈیڈی کے کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ باہر سے ایک دوسرا ملازم کریم اندر آیا۔ وہ غفور سے مخاطب ہوا؟ ''مولوی صاحب نے کہا ہے کہ جو شخص رشوت لیتا ہے اور جس کے گھر کے کسی فرد کے اندر چوری وغیرہ کی عادت موجود ہو اس سے اللہ تعالیٰ کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اور یہی نہیں بلکہ ایسے شخص سے یا تو اس کا حافظہ چھین لیتا ہے یا اس کی آنکھوں کی روشنی۔ اور یہ سب کچھ نہیں تو اسے گونگا بنا دیتا ہے۔ اور......''

''کیا مولوی صاحب نے معافی کا کوئی طریقہ نہیں بتایا؟'' غفور نے درمیان میں پوچھا۔

''بتایا ہے۔''

''کیا؟'' شکیل نے جلدی سے کریم سے پوچھا۔

''انھوں نے کہا ہے کہ اگر وہ شخص خود تین دن تک توبہ کرے اور اس کے گھر میں جو فرد چور ہے وہ بھی اپنے گناہوں کی معافی مانگے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں کی روشنی واپس دے سکتا ہے۔......''

''میں اپنے ڈیڈی کی آنکھوں کی روشنی کے لیے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں گا۔'' شکیل نے بڑی عقیدت اور شرمساری سے کہا۔

غفور اور کریم منہ پھیر کر اپنی کامیاب اداکاری پر مسکرا اٹھے۔

ایک ہفتے بعد کا ذکر ہے، مجسٹریٹ صاحب شکیل کے اسکول چلے جانے کے بعد اپنی بیگم اور ملازموں سے ہنس ہنس کے کہہ رہے تھے، ''بھئی نہ میں وہ کہانی پڑھتا نہ شکیل میاں چوری کی عادت چھوڑتے۔''

''جب ہی تو کہتے ہیں کہ اچھی کہانی ذہن و دماغ کے ساتھ ساتھ کردار سنوارنے کے لیے بہترین ٹانک ہوتی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے ان کی تائید میں کہا اور مجسٹریٹ صاحب کہانی کی مصنفہ کو شکریہ اور مبارک باد کا خط لکھنے بیٹھ گئے۔

●●● (ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جنوری 1967)

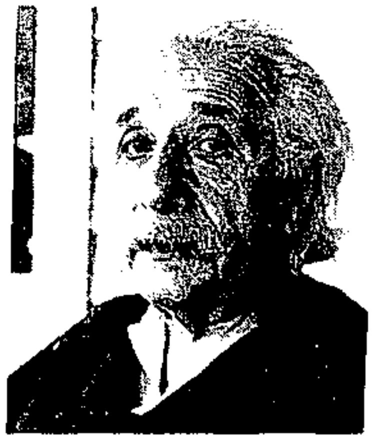

البرٹ آئن اِسٹائن ایک عظیم سائنس داں

محمد خلیل

تم نے البرٹ آئنسٹائن کا نام ضرور سنا ہوگا۔ وہ ایک عظیم سائنس داں تھے۔ وہ جرمنی کے مشہور شہر میونخ کے ایک قصبہ الم میں 14 مارچ 1879 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام ہرمن اور والدہ کا نام پادین تھا۔ ان کی چھوٹی بہن کا نام ماجا تھا۔

آئنسٹائن بچپن سے بہت سنجیدہ تھے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح کھلونوں سے نہیں کھیلتے تھے اور نہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل میں حصہ لیتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ وہ استاد کے ہر سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دیتے تھے۔ دیر سے جواب دینے کی وجہ سے انھیں کمزور طالب علموں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کے نتیجے میں انھیں سزا بھی ملتی رہتی تھی۔ ان کا پسندیدہ مضمون ریاضی (جیومیٹری) تھا۔ جب آئنسٹائن نے پہلی مرتبہ جیومیٹری پڑھنی شروع کی تو انھیں یہ مضمون اتنا دلچسپ معلوم ہوا کہ جب تک کتاب ختم نہ ہوئی، وہ اسے پڑھتے ہی رہے۔ جہاں قدرت نے انھیں اپنے پسند کے مضمون میں کھو جانے کی تو خصوصیت عطا کی تھی، لیکن انھیں تعلیم کے لیے پوری آسانیاں نہیں ملی تھیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ کمزور طالب علم کی حیثیت سے انھیں مختلف جگہوں پر پڑھنا پڑا۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح پڑھائی میں لگے

رہے آخر 21 سال کی عمر میں انھوں نے زیورخ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ پھر کافی پریشانیوں کے بعد انھیں ایک آفس کلرک کی جگہ مل گئی۔ وہ خود ٹیچر بننا چاہتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھیں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں انھوں نے کئی نئی ایجاد کی ہوئی مشینوں کو دیکھنے کا موقع ملا اور وہیں ان کے دماغ میں سائنسی سوجھ بوجھ کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے انھوں نے کسی لیبارٹری (تجربہ گاہ) میں کام نہیں کیا تھا۔ جب بھی انھیں وقت مل جاتا وہ کاغذ پنسل سنبھال کر ریاضی کے مسائل کو حل کرتے رہتے۔

1905 میں بہت محنت کر کے آئنسٹائن نے ایک سائنسی مقالہ ایک مشہور سائنسی جریدے میں بھیجا۔ اس مضمون کے شائع ہونے سے ان کو بڑی شہرت ملی اور انھیں زیورخ یونیورسٹی کا پروفیسر بنایا گیا 1913 میں جب ان کی عمر 24 سال کی تھی، جرمنی کی سائنس اکیڈمی نے انھیں اپنا رکن بنایا۔ یہ ایک کم عمر سائنس داں کی بہت بڑی عزت افزائی تھی۔ اس کے بعد آئنسٹائن جرمنی سے امریکہ آ گئے۔ 1912 میں انھوں نے ''فوٹو الکٹرک'' کی دریافت کی، جس کے لیے انھیں نوبل انعام سے نوازا گیا، جو دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھا جاتا ہے۔ آج ان کی اس دریافت کا استعمال ٹیلی ویژن میں کیا جا رہا ہے۔ اس انعام کی رقم انھوں نے عوام کی مدد کے لیے دے دی تھی۔ ایک اور موقع پر انھیں ڈھائی ہزار ڈالر کا چیک ملا، جو ایک ادارے نے انھیں انعام کے طور پر دیا تھا، لیکن آئنسٹائن کے دل میں ان چیزوں کی اہمیت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس چیک کو کتاب میں رکھ کر بھول گئے، اور وہ کتاب اتفاقیہ طور پر گم ہو جانے سے چیک بھی گم ہو گیا، لیکن انھیں کوئی افسوس نہ ہوا۔

اتنے بڑے سائنس داں ہونے پر آئنسٹائن میں ذرا بھی غرور نہ تھا۔ انھیں مغربی سنگیت اور وائلن بجانے سے بڑا لگاؤ تھا۔ بقول ان کے انھیں سائنس سے دلچسپی اسکول کے زمانے میں ہی ہو گئی تھی۔ اس زمانے انھیں کہیں ''قطب نما'' کی ڈبیا مل گئی تھی، جس کی سوئی ایک خاص سمت میں جا کر رک جاتی تھی۔ اس مقناطیسی سوئی (میگنیٹ نیڈل) کے عمل کے ذریعے البرٹ آئنسٹائن کا سائنس سے پہلا تعارف ہوا انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ الجبرا سے ان کی دلچسپی بڑھانے میں ان کے چچا جیک کا ہاتھ تھا۔

آئنسٹائن نے اپنے آپ کو سائنس کے لیے وقف کر رکھا تھا، وہ تڑک بھڑک والی پوشاک پسند

نہیں کرتے تھے۔وہ عام طور پر ڈھیلی ڈھالی پتلون اور جرسی پہنتے تھے۔اس سے ان کی سادہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔اگر انھیں کسی چیز کا خیال رہتا تھا تو وہ صرف ان کا اپنا کام یعنی سائنسی تحقیقات تھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک انسان خیال تھے، اس کے بعد سائنسداں۔اتنے بڑے سائنس داں ہوتے ہوئے وہ نہایت ہمدرد تھے اور ان میں شرمیلا پن جھلکتا تھا۔یہ خصوصیات ان میں آخیر عمر تک باقی رہیں۔

سائنس کی دنیا میں کسی نام کو اتنی شہرت نہیں ملی جتنی شہرت البرٹ آئنسٹائن کو حاصل ہوئی۔ جاپان میں ایٹم بم گرائے جانے کا انھیں بہت صدمہ تھا۔زندگی کے آخری دنوں میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔آخری وقت میں جب وہ ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے تو جرمن زبان میں کچھ کہنا چاہتے تھے، جسے سنا نہ جاسکا۔اس طرح کوئی نہ جان سکا کہ دنیا کو اتنا بہت کچھ دینے والا سائنس داں آخری وقت میں کیا کہنا چاہتا تھا اور ایک عظیم سائنس داں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

(ماہنامہ ''کھلونا''، نئی دہلی، جنوری1967)

اردو

کیف احمد صدیقی

سب زبانوں کی جان ہے اردو
کتنی پیاری زبان ہے اردو
سارے الفاظ قیمتی گوہر
جوہری کی دکان ہے اردو
یہ تراشے ہوئے حسیں جملے
جیسے ہیروں کی دکان ہے اردو
ایک ایک حرف مثل شیر و شکر
کتنی میٹھی زبان ہے اردو
ساری دنیا میں جس کی شہرت ہے

فخر ہندوستان ہے اردو
خواہ ہندو ہو سکھ ہو یا مسلم
ہر بشر کی زبان ہے اردو
شہر دلی کا صرف دل ہی نہیں
سارے بھارت کی جان ہے اردو
حیدرآباد و لکھنؤ ہی نہیں
ہر جگہ کی زبان ہے اردو
کتنی صدیاں گزر چکیں لیکن
آج تک نوجوان ہے اردو
کیف اردو کے جو مخالف ہیں

بجلی کا انجینئر

فیروز بخت احمد

رشید ساتویں جماعت کا طلب علم تھا۔ اس نے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ بڑا ہو کر بجلی کا انجینئر بنے گا۔ وہ اکثر گھر میں آئے ہوئے بجلی کے کاریگروں کو کرتے ہوئے دھیان سے دیکھتا تھا۔ اس طرح وہ کافی باتیں جان گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ بجلی کا کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ربڑ کے چپل پہن لینے چاہئیں۔ ہاتھ گیلے نہیں رکھنے چاہئیں۔ اور تاروں کو کھولنے سے پہلے مین سوئچ بند کر لینا چاہیے، وغیرہ۔ رشید بیٹری سے چلنے والی چیزیں بھی بنا لیتا تھا۔ اس نے کئی نئی چیزیں بیٹری کی مدد سے بنائی تھیں۔ اپنی کتابوں کی الماری میں اس نے بیٹری سے چھوٹی چھوٹی بتیاں لگائیں تھیں جو بٹن دباتے ہی جل اٹھتی تھیں۔ اپنی سال گرہ پر اس نے بیٹری سے چلنے والی گھنٹی بھی خریدی تھی۔ ایک دن رشید نے اپنے ابا سے کہا ''اس کا خیال ہے کہ وہ بجلی کا انجینئر بنے گا۔'' وہ بولے ''ہم تو تمھیں ڈاکٹر بنائیں۔'' پھر انھوں نے ڈاکٹر بننے کے فائدے بتائے۔ مگر رشید تو صرف بجلی کا انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کبھی موقع آئے گا تو اپنے ابا کو بتا دے گا کہ اس میں انجینئر بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔

ایک دن رشید کو اپنی صلاحیت دکھانے کا موقع مل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ اس کے ابا کی میز سے روز پین وغیرہ غائب ہونے لگے۔ ایک دن تو حد ہوگئی۔ رشید کے ابا اپنی گھڑی میز پر چھوڑ کر بھول

گئے تو وہ بھی غائب ہوگئی پہلے ان کو شک اپنے نوکر پر گیا۔ لیکن کافی پوچھ گچھ کے بعد انھیں اطمینان ہوگیا کہ وہ چور نہیں ہے پھر ان کا شک رشید کے دوستوں پر گیا جو کھیلتے کھیلتے ان کے کمرے میں جا گھستے تھے۔ سب سے پوچھا گیا، لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ ابا نے حفاظت کے خیال سے بچوں کا اپنے کمرے میں آنا جانا بند کر دیا۔

رشید کو اپنے دوستوں میں سے صرف شاہد پر شک تھا کیونکہ وہ یہاں اس کے پڑوس میں نیا نیا آیا تھا اور اس کی عادتیں بھی اچھی نہیں تھیں۔ ایک بار وہ اس کے سامنے پین چُراتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

رشید کے آنگن کی دیوار چھ فٹ اونچی تھی، جس کے دوسری طرف شاہد کا گھر تھا۔ شاہد دیواریں پھاندنے اور پیڑوں پر چڑھنے کا بڑا ماہر تھا۔ آنگن کے دوسری طرف کونے میں ایک بڑا سا صندوق رکھا تھا۔ جس میں کھلونا بک ڈپو کی خوبصورت کہانیوں کی کتابیں اور ''کھلونا'' کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ یہ کتابیں اور رسالے رشید کو جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے ''کھلونا'' کے پرانے شمارے بہت پسند تھے۔ اسے جہاں بھی ''کھلونا'' کا کوئی پرانا پرچہ مل جاتا وہ اسے ہر قیمت پر خرید لیتا۔ صندوق میں وہ تالا نہیں لگاتا تھا کیونکہ وہ اسے اکثر کھولتا رہتا تھا۔

ایک دن چھٹی کے روز اس کا دل چاہا کچھ مزے دار کتابیں پڑھ کر اپنا دل بہلائے۔ وہ آنگن کے کونے میں گیا۔ اس نے صندوق کھولا ہی تھا کہ اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہاں صرف دس بارہ کتابیں رہ گئی تھیں۔ باقی کتابیں اور رسالے غائب تھے۔ اس کو یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا اور اس نے فیصلہ کر لیا جیسے بھی ہوگا چور کو ضرور پکڑے گا۔ اگر چور ہاتھ آ گیا تو پھر اس کی وہ شامت آئے گی کہ زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ مگر کیسے؟ وہ چور کس طرح پکڑے؟

اس رات اسے نیند بالکل نہیں آئی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ چور کس طرح پکڑے۔ صندوق میں صرف آخری بار کتابیں لے جانے کو بچی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ چور ان کو ضرور لینے آئے گا۔ اس نے سوچا کہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جیسے ہی چور صندوق کھولے اسے پتہ چل جائے۔ اس نے نہ جانے کیا سوچا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔

اگلے دن ساری دو پہر رشید اپنے بجلی کے کھیل میں لگا رہا۔ پھر فضول کا کام کرنے کے بعد وہ کھیلنے کے لیے چلا گیا رات کو جب وہ سویا تو اس کے دل پر کسی طرح کا بوجھ نہ تھا۔

رات کے تقریباً ایک بجے اچانک گھنٹی بجی۔ رشید چھلانگ لگا کر اٹھ گیا۔ بتیاں جلا کر وہ آنگن کے کونے میں گیا تو کیا دیکھا ہے کہ چور دیوار پھلانگنے ہی والا ہے۔ جھپٹ کر رشید نے اس کو زوردار گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ اس نے بھی رشید سے خوب مورچہ لیا مگر رشید نے اسے نہ چھوڑا۔ اس نے شور مچا کر سب کو اٹھا دیا۔ شور سن کر رشید کے اماں، ابا دونوں آگئے۔ رشید کے بڑے بھائی نے اس کو چھڑایا اور شاہد کو پکڑ لیا۔ چور رنگے ہاتھوں پکڑا جا چکا تھا۔

رشید کے ابا نے گھڑی چوری ہونے کی وجہ سے پولیس کو بلانے کو کہا لیکن شاہد معافی مانگنے لگا۔ اس نے وہ ساری چیزیں واپس دے دیں جو اس نے چرائی تھیں۔ اس نے وہ چیزیں بڑی چالاکی سے اپنے لان کی زمین میں دبا رکھیں تھیں۔ رشید کو اپنے سارے رسالے اور کتابیں بھی واپس مل گئے تھے۔ شاہد کے ماں باپ نے ان سے معافی مانگی اور شاہد کو سزا دینے کو کہا۔ اس کے بعد سے شاہد کے ساتھ محلے کے دوسرے لڑکوں نے بھی کھیلنا چھوڑ دیا۔

رشید نے اپنی ترکیب ابا کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اسے انعام میں ایک نئی گھڑی دے دی جو انھوں نے پرانی گھڑی کھو جانے پر خریدی تھی۔

رشید نے یہ کیا تھا کہ اس نے بجلی کی گھنٹی اپنے کمرے کی دیوار پر لگائی اور تاروں کو دیواروں کے سہارے اس صندوق تک لے گیا جس میں کہانیوں کی کتابیں اور "کھلونا" کے پرانے شمارے رکھے تھے۔ اس نے ایک کیل صندوق کے اندر دائیں دیوار پر لگائی اور دوسری صندوق کے اندر ڈھکنے پر۔ پھر گھنٹی کے بٹن والے ایک تار کو اس کیل میں باندھ دیا۔ اس کے بعد جب اس نے ڈھکن کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو تار اور کیل آپ میں جل گئے اور اس کے کمرے میں گھنٹی بج اٹھی۔ رات کو شاہد نے ڈھکن کو ہلایا ہی تھا کہ رشید کے کمرے میں گھنٹی بجنے لگی اور وہ اٹھ کر چور کو پکڑنے کو بھاگا۔

شام کو جب رشید کے ابا اخبار پڑھ رہے تھے تو رشید ان کے پاس گیا اور بولا "اب آپ بتایئے آپ مجھے بجلی کا انجینئر بنائیں گے یا ڈاکٹر؟"

"بجلی کا انجینئر یعنی الیکٹرانکس انجینئر!" ابا مسکراتے ہوئے بولے۔

رشید کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ●●● (ماہنامہ "کھلونا"، نئی دہلی، دسمبر 1975)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

آرٹ کی کہانی

مصنفہ : سیما پرویز

صفحات:64

قیمت :-/12روپے

اکبرالہٰ آبادی

مصنفہ : صغرامہدی

صفحات:60

قیمت :-/10روپے

انوکھی کہانیاں

مرتبہ : محمد قاسم صدیقی

صفحات:31

قیمت :-/7روپے

عرب کی لوک کہانیاں ایک تہذیبی ورثہ

مصنف :حسن عسکری کاظمی

صفحات:131

قیمت :-/15روپے

ایلس آئینہ گھر میں (دوسرا حصہ)

مصنف :لیوس کیرل

صفحات:96

قیمت :-/13روپے

آدم زاد پری لوک میں

مصنف :ضمیر درویش

صفحات:110

قیمت :-/10روپے

₹ 24/-

ISBN: 978-81-7587-764-1

9 788175 877641

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025